

مخدوم علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی
الغزنوی ثم الجویری المعروف به

داتا گنج بخش علیہ السلام

اور

ان کا عہد



خالد محمود



مقبول اکیڈمی، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

۲۹۷۶۹۹۲۲

ع ۹۲ خ

۲۰۰۷

اہتمام: ملک مقبول احمد

طبع اول ۱۹۷۵ء

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت: اٹھارہ روپے

مقبول اکیڈمی، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی لاہور

انتساب

حضرت داتا گنج بخش

رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

جن کا چشمہ فیض

آج بھی جاری ہے

مندرجات

باب ۱

حیات و صفات

۱۲-۲۴

★ مولد ★ خاندان ★ روحانی نسبت

★ تعلیم و تربیت ★ ماہر علوم

★ تصوف کی راہ پر چلنے ★ جمع اموال ★ شادی

★ اولاد ★ لباس

★ علمی تحقیق ★ ذخیرہ کتب

★ دعوت و ارشاد ★ مناظرہ کرامت و

خطابت ★ وفات ★ سال و مناسبات

باب ۲

مزار

۲۵-۳۹

★ حج و اعتکاف

★ قرآن حکیم کے نادر نسخے ★ متولی

باب ۳

درویشی

۴۰-۵۱

★ لاہور میں درویشی ذاتی بیان ★ دوبار آتے

★ سلطان الشاہ کی روایت ★ ناگوار مقام ★ پیشرو

باب ۴

داتا صاحب کے عہد کا لاہور

۵۲-۷۸

★ پنجاب کا سیاسی نقشہ ★ پرانا نام ★ لاہور کا وجود

★ رام چندر کے بیٹے سے نسبت

★ سرحد کا لاہور ★ لاہور: ایک ریاست

★ مندھور سے محمود پور تک ★ لاہور کشف المحجوب میں

★ لاہور کا غزنی سے تعلق ★ غزنویوں کی پناہ گاہ

★ سیاسی انتظام ★ ایاز کی آمد ★ سلجوقیوں کا عروج

★ نادر لہندی کی بنیاد ★ مجدد کا خاتمہ ★ ہندوؤں

کاظم ★ علی بن دینار کی بغاوت ★ غزنی میں انقبلا

★ لاہور کا نیا حاکم ★ مرکز ثقافت

★ محمود کی تلوار، صوفی کی محبت ★ لاہور میں غازی
★ مختلف عقائد ★ داتا صاحب کی تمنا
★ پیٹر فیض ★ کچھ بخش

★ ہندوؤں کی نفرت ★ محمود کی بنو دلواری
★ غزوی کے ★ توسیع سلطنت یا اشاعت دین؟
★ جیسا دیر شہر

★ قدیم ترین نسخہ ★ خراج عقیدت ★ لاہور کا اعزاز
★ یادداشت ★ ترتیب ★ ویر تصنیف
★ نام ★ کتابوں کا سرور ★ مجتہد از تصنیف ★
دوسری تصانیف ★ کتابوں کا اطلاق

★ سامان سفر ★ ایک مصلیٰ، ایک چھتری
★ سیاسی حالات ★ فکری انتشار

★ معاصرین

★ علم و عمل ★ طریقت و شریعت ★ مجاہدہ و مشاہدہ
★ ولی کون؟ ★ ایمان ★ طہارت ★ توبہ
★ نماز ★ محبت الہی ★ زکوٰۃ ★ روزہ
★ حج ★ دعوت و تبلیغ ★ سماع

باب ۵

داتا صاحب لاہور میں
۸۸-۷۹

باب ۶

محمود کی تلوار یاد دہش کی زبان
۸۹-۹۹

باب ۷

کشف المحجوب
۱۰۰-۱۱۵

باب ۸

سیاحت
۱۱۶-۱۳۲

باب ۹

معاصرین
۱۳۳-۱۵۰

باب ۱۰

انکار و نظریات
۱۵۱-۱۷۰

ماخذ

۱۷۱-۱۸۱

سید مجبور



سید مجبورِ محمّدومِ امم

مرتدا و پیرِ سنجرِ اعرم

بندِ ہاتے کو ہزار آساں گینخت

در زمینِ ہندِ تخمِ سجدہ ریخت

عہدِ فاروق از جمالش تازہ شد

حق ز حرفِ او بلند آوازہ شد

پاسبانِ عزتِ امم الکتاب

از لگا ہش خانہ باطل خراب

خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ گشت

صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت

عاشق و ہم قاصدِ طیارِ عشق

از جنبشِ آشکارا سرِ ارِ عشق

مقدمہ

پانچویں صدی ہجری کو مشرقی دُنیا نے اسلام کی سیاسی، عسکری، تہذیبی اور فکری تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ زمانہ — کشور کشاؤں میں محمود غزنوی اور الپ ارسلان کا، شعرو سخن میں فردوسی، عنصری اور عمر خیام کا، تاریخ نگاری میں عینی اور بیہقی کا، سیاست اور جہان بینی میں کیاؤس اور نظام الملک طوسی کا صوفیوں میں ہمارے داتا صاحب — حضرت ابوالحسن علی بن عثمان البحریری کا زمانہ تھا۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کی سلطنت بحر اوقیانوس سے بحر ہند تک، تین براعظموں میں کرہ ارض کے کم و بیش ایک تہائی عرض پر محیط تھی۔ تاہم اس میں مرکزیت کا وجود باقی نہ تھا۔ مغرب میں ہسپانیہ کی آزاد ریاست تھی۔ مصر کے علاوہ شام اور عراق کے کچھ حصوں پر فاطمیوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی مشرقی عراق اور جنوب مغربی ایران پر سلاطین بویہ کو تسلط حاصل تھا بلکہ اس صدی کے نصف اول تک انہیں خلیفہ بغداد پر بھی بالادستی حاصل تھی۔ غزنویوں نے خراسان، افغانستان اور شمالی ہندوستان پر مشتمل ایک وسیع سلطنت قائم کر لی تھی۔ اس صدی کے نصف آخر میں خراسان میں ایک نئی قوت سلجوق ابھرے اور غزنویوں کو صرف افغانستان اور شمالی ہندوستان پر قناعت کرنا پڑی۔ پوری اسلامی دنیا کا مغربی حصہ تو پہلے ہی خلفائے بغداد کے دائرہ اثر سے باہر تھا لیکن مشرقی حصہ میں بھی اُن کا نام فقط خطبوں اور سرکاری دستاویزات میں ہی باقی رہ گیا تھا۔ خلفائے بغداد مشرق کے ان خود مختار حکمرانوں پر حکم چلانے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اُن کے پاس اپنی بات منوانے کے لئے عامہ کے دباؤ کے سوا کوئی ذریعہ باقی نہ تھا۔ بہر کیف وہ رائے عامہ کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا فن خوب جانتے تھے مثلاً جب محمود غزنوی نے سمرقند کو اپنی ظلم و میں شامل کرنا چاہا تو خلیفہ القادر باللہ نے کہلا بھیجا "اگر میری مرضی کے خلاف سمرقند کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھو گے تو میں ساری دُنیا کو تمہارے خلاف ابھار دوں گا۔"

محمود غزنوی یہ دھمکی سن کر پہنچ پا ہو گیا۔ اس نے بڑے غصہ کے ساتھ خلیفہ کے سفر کو جواب دیا: اچھا! آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں ہزار ہا کوہ پیکر ہاتھیوں سے بغداد کو روند ڈالوں اور بارگاہِ خلافت کا طعنے تک ہاتھیوں پر لا کر غزنی لے آؤں؟ خلیفہ بغداد نے اس کے جواب میں سورہ فیل لکھ بھیجی۔ محمود اس کا مفہوم جان کر ابدیدہ ہو گیا۔ اگرچہ محمود غزنوی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی پوری قوت رکھتا تھا مگر راتے عامہ کو اپنے خلاف نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بغداد نے غزنین پر نفسیاتی فتح حاصل کر لی۔

مصر میں فاطمی خلفا کے عروج کا زمانہ عراق میں عباسی خلفا کے زوال کا زمانہ تھا۔ ہمارے زیر نظر زمانہ میں شیعہ سنی اختلاف محض عقائد کا اختلاف نہ رہا تھا بلکہ سیاسی اختلاف بھی بن گیا تھا۔ مصر کے خلفا شیعہ عقائد کے اور بغداد کے خلفا سنی عقائد کے "مخافظ" بن گئے تھے۔ فاطمیوں کے زیر اثر علاقوں میں سنیوں کی اور عباسیوں کے زیر اثر علاقوں میں فاطمیوں اور ان کے خیر خواہ قرامطیوں اور اسمعیلیوں کی تطہیر کا سلسلہ مذہبی سے زیادہ سیاسی وجوہ کی بنا پر جاری تھا۔ مثلاً محمود غزنوی کا وزیر ابوعلی حسن بن محمد المعروف بہ حنک ۴۱۴ھ / ۱۰۲۳ء میں حج سے واپس آ رہا تھا تو نجد کے غیر یقینی حالات کے باعث فلسطین اور شام کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ علاقے فاطمیوں کے زیر اثر تھے۔ فاطمی خلیفہ الظاہر نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حنک کو خلعت سے نوازا اور اس کے ہاتھ محمود غزنوی کے لئے دوستی کا پیغام ارسال کیا۔ اس واقعہ نے خلیفہ بغداد اتقاد کو بکھلا دیا۔ اس نے الزام لگایا کہ حنک قرامطی ہو گیا ہے اور محمود سے مطالبہ کیا کہ اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ محمود غزنوی یہ الزام اور مطالبہ سن کر برہم ہو گیا۔ اس نے اپنے سیکرٹری کو حکم دیا: اس بڑھے خلیفہ کو لکھو کہ عباسیوں کی خیر خواہی میں ساری دنیا سے نبرد آزما ہوں اور قرامطیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ٹھکانے لگا رہا ہوں۔ اگر یہ بات ثابت ہو جاتی کہ حنک قرامطی ہے تو خلیفہ کو پتہ چل جاتا کہ اس کا کیا شر کرتا ہوں۔ میں نے اسے پالا پوسا ہے۔ وہ میرے بیٹوں اور بھائیوں جیسا ہے۔ اگر وہ قرامطی ہے تو میں بھی ہوں۔ اس جواب کے ساتھ وہ خلعت بھی بغداد روانہ کر دی جو الظاہر نے حنک کو دی تھی تاکہ خلیفہ اسے مذہبِ آتش کرے۔ اس واقعہ کے سولہ سترہ برس بعد سلطان مسعود نے ذاتی عداوت کے باعث حنک کو قرامطی قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ تعصب صرف سنیوں میں شیعوں کے خلاف یا شیعوں میں سنیوں کے خلاف ہی نہ تھا بلکہ خود

اہل سنت بھی بیسویں فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور آپس میں دست بہ گریبان تھے۔ خراسان اور ماوراءالنہر میں حنفیوں کا بڑا زور تھا۔ غزنیوں کی سرپرستی سے اس مکتب فکر کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ قبول عام میں دوسرا درجہ شافعیوں کو حاصل تھا۔ حنبلیوں اور مالکیوں کی تعداد بھی قابل لحاظ تھی۔ تاہم سنیوں کی فکری تقسیم اپنی چار مکاتب فکر پر ختم نہ ہو گئی تھی بلکہ ان میں سے ہر فرقہ کئی ذیلی فرقوں میں بٹا ہوا تھا۔ مقدسی نے "احسن التقاسیم" میں اس عہد کے فرقوں اور ان کے تعصبات کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بڑی ہولناک ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس وقت شیعوں کے فرقے یہ تھے: معتزلہ، اسماعیلی، فاطمی، قرامطی، اور ہروشی۔ خارجیوں کے دو فرقے تھے: شراۃ اور قعدہ۔ شافعیوں میں اہلبیت، صدیقیہ اور سالمیہ۔ حنبلیوں میں برہاری۔ حنفیوں میں زعفرانی، سبکی، عردسی، نجاری اور کرامی فرقے تھے۔ ان کے علاوہ دآودی، اشعری، فضلی اور عملی فرقے بھی تھے۔ مقدسی نے صوفیوں کو الگ فرقہ قرار دیا ہے لیکن نام صرف ایک حنبیہ کا لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے: "ان فرقوں کے باہمی لڑائی جھگڑے دیکھ کر دل پارہ ہوتا ہے" کشف المحجوب کا مقصد مسلمانوں کے تفرقہ پر روشنی ڈالنا نہیں تاہم صوفیانہ مباحث میں بعض فرقوں کے خیالات زیر بحث آگئے ہیں ان میں اہل سنت کے چار مکاتب فکر کے علاوہ حشویہ، تمسکین، مرجیہ، قدیریہ، جبریہ، معتزلہ، مشہدین، قرامطی، باطنی، شیعہ، خارجی اور دہریہ شامل ہیں۔ داتا صاحب نے صوفیوں کے بھی بارہ فرقے گنوائے ہیں جن میں سے دس فرقوں یعنی نوری، عباسی، نصاریٰ، طیفوری، جنیدی، سہیلی، حکیمی، خرازی، خضیفی اور یاری کو مقبول اور دو فرقوں۔ حلولی اور عللاجی کو مردود قرار دیا ہے۔ (۳)

اس زمانہ میں "تقلید" کا چلن عام تھا۔ اہل سنت کے چاروں مکاتب فکر ایک دوسرے سے دست بہ گریباں ہونے کے باوجود ان چاروں میں سے کسی ایک کی تقلید لازمی قرار دیتے تھے۔ پابند شریعت صوفیوں کے مختلف فرقے بھی ان میں سے کسی نہ کسی مکتب فکر سے منسلک تھے تاہم یہ صوفیا اپنے زمانہ کے علما، خطباء اور مناظرین کی طرح دوسرے مکاتب فکر کی مذمت نہ کرتے تھے۔ شیخ ابوسعید بن ابی الخیر المہینی شافعی تھے اور ہمارے داتا صاحب حنفی تھے۔ اس کے باوجود آپ شیخ ابوسعید سے بڑی ارادت رکھتے تھے۔ داتا صاحب نے امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد حنبل کو تابعین میں صوفیا کے اماموں میں شامل کیا ہے اور چاروں کا ذکر بڑی محبت اور

کیاں عقیدت سے کیا ہے۔ داتا صاحب نے حضرت بایں مدبیطاچی کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ "خالص توحید الہی کے سوا سب امور میں علما کا اختلاف رحمت ہے۔"

داتا صاحب نے اپنے زمانے کی بدبختی یہ بتائی ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے چند خاص بندوں کے سوا باقی سب لوگوں نے اسلام کی حقیقت کو چھوڑ کر صرف عبارت پر اکتفا کر لی ہے اور کام تحقیق سے نکل کر تقلید میں پڑ گیا ہے۔" داتا صاحب اپنے مریدوں کو تقلید سے بچنے اور تحقیق کو اپنانے کی تاکید فرماتے ہیں۔ اپنے استاد حضرت اشتغافانی کے تذکرہ میں مریدوں پر واضح کرتے ہیں کہ "تقلید تو معنی میں بھی اچھی نہیں ہوتی لہذا عبارت میں تقلید کیسے درست ہو سکتی ہے؟ شیخ احمد نجاری سے ملاقات کا حاصل یہ قرار دیا ہے کہ "مخلوق میں سے کسی کی تقلید نہ کی جائے" داتا صاحب نے تقلید کو علما کا اور تحقیق کو صوفیا کا چلن قرار دیا ہے اور خود کو جگہ جگہ محقق لکھا ہے۔ کشف المحجوب میں اس تحقیقی ذوق کے نمونے جا بہ جا ملتے ہیں۔ داتا صاحب نے شیخ ابو عبد الرحمن السلمی کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے اور ان کی کئی تصانیف کے حوالے بھی دیتے ہیں مگر جہاں کہیں کوئی بات کھٹکی ہے وہاں اپنی اختلافی رائے بر ملا ظاہر کر دی ہے۔ مثلاً یہ کہ "السلمی نے مسطح بن اثاثہ بن عباد کو بھی اصحاب صفہ میں شامل کیا ہے لیکن میں دل سے اسے دوست نہیں رکھتا کیونکہ ام المومنین حضرت عائشہؓ پر تہمت کی ابتداء اسی مسطح نے کی تھی۔" داتا صاحب کے محققانہ رویے کا نقطہ عروج یہ ہے کہ اپنے مرشدوں کے مرشد حضرت جنیدؒ پر بھی تنقید سے گریز نہیں کیا۔ انہوں نے بنید کے بارے میں حضرت جنیدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "نہیں مجاہد الہی پر خدا کی بخشش ہے۔" داتا صاحب اس پر لکھتے ہیں "تعجب ہے کہ حضرت جنیدؒ تو صاحبِ محمود تھے مگر یہاں سُکر کی تعریف فرما رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ بات حال کے غلبہ میں کہی ہو۔" صوفیا میں اس تحقیقی روش کی انتہا داتا صاحب کے خود سمجھنے الغزالی کے یہاں ملتی ہے جو داتا صاحب کے ایک استاد حضرت ابو القاسم گرگانیؒ کے مرید شیخ ابو علی فارمدیؒ کے شاگرد تھے۔ غزالی سے پوچھا گیا "آپ مذہب میں کس کے مقلد ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "غلیبان میں عقل کا منقولات میں قرآن مجید کا اور ائمہ میں سے کسی کا بھی مقلد نہیں ہوں۔"

محمود غزنوی نے ہندوستان کی سرزمین کو توفیح کر لیا تھا مگر اس عمل کے دوران البیرونی کے بقول ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت پیدا کر دی تھی۔ جب تک نفرت کی یہ دیوانہ

ندی جاتی تب تک اہل ہند کے دل فتح نہیں کئے جاسکتے تھے۔ جو کام ایک سلطان اپنے لاؤشکر سے نہ کر سکا تھا وہ ایک ایسے فخر نے انجام دیا جو صرف ایک گڈری، ایک مھٹے، ایک لٹا اور ایک پھڑی کی متاع لے کر لاہور آیا تھا۔ یہ درویش ہمارے دانا صاحب تھے۔ انہوں نے یہ کارنامہ کسی قسم کی سرکاری سرپرستی کے بغیر انجام دیا۔ انہیں بادشاہوں اور امرا سے جو نفرت تھی اس کا اظہار کشف المحجوب میں کئی جگہوں پر ہوا ہے۔ اس نفرت کا سبب یہ تھا کہ امرا عوام کو لڑتے تھے اور اسلامی احکام سے روگردان تھے۔ لہذا دانا صاحب نے اپنے مریدوں کو امر آسے راہ و رسم رکھنے کی بڑی سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے۔

دانا صاحب کی شخصیت اور ان کے مشن کو اس عہد کے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں ہی پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ اس تناظر میں اس مسلم انقلابی کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ اس قدر دلکش ہے کہ بے اختیار ان کے قدموں سے لپٹ جانے کو چاہتا ہے۔ اسے ہماری بے نیسی کہہ لیتے کہ دانا صاحب کے سوانحی حالات کسی ذریعہ سے بھی معلوم نہیں ہوتے۔ سوانح نگاروں کو اس مقصد کے لئے صرف کشف المحجوب پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ لہذا اکثر مباحث میں کشف المحجوب کے اقتباسات کی تکرار سے مفرز تھا۔ /

میں نے عام راج کے مطابق مآخذ کے حوالے پر صفحہ پر دینے کے بجائے کتاب کے آخر میں یکجا کر دیتے ہیں۔ ہر صفحہ پر انگریزی میں جو نمبر دیتے گئے ہیں وہ اس صفحہ کی نشاندہی کرنے ہیں جس پر مآخذ بیان کئے ہیں اس سے سنجیدہ قارئین کو ضرور الجھن ہوگی مگر عام قارئین کو بڑی سہولت ہے گی۔ آخر میں ایک ایسے مہربان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کے مخلصانہ تعاون کے بغیر یہ کتاب تکمیل کو نہ پہنچ سکتی تھی۔ عزیزم عبدالوہاب خان سلیم کے ترک وطن کے بعد مجھے امید نہ تھی کہ اس تالیف کے لئے درکار کتب اور جرائد جمع کر سکوں گا مگر محترم مصباح الحق صدیقی، لاہور میں دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور میں لاہور نے جس فراہمی سے اپنے خزانے میرے حوالے کر دیتے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں۔

خالد محمود

۱۲۲ بی نیومن آباد لاہور

حیات و صفات

حضرت داتا صاحبؒ کی صحیح تاریخ ولادت کسی مستند ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکی۔ تاہم زمانہ حال کے بعض سوانح نگاروں نے آپؒ کا سال ولادت ۵۴۰۰/۱۰-۱۰۰۹ء لکھا ہے۔ داتا صاحبؒ کے سوانح نگاروں کا سب سے پرانا ماخذ "نفحات الانس" مرتبہ نور الدین جامیؒ ہے جو ۵۸۸۳/۱۶۷۸ء میں مکمل ہوا۔ اس میں داتا صاحبؒ کے سال ولادت کی کوئی تصریح نہیں کی گئی۔ آئین اکبری (۱۰۰۲/۱۵۹۳ء) میں بھی سال ولادت درج نہیں آئیں اکبری کے ۵ سال بعد مرتب ہونے والے تذکرۃ الاولیاء "ثمرات القدس" مؤلفہ نعل بیگ بخشی میں بھی تاریخ پیدائش درج نہیں۔ شہزادہ داراشکوہ نے "سفینۃ الاولیاء" میں بزرگان دین کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں درج کرنے کا بڑا خیال رکھا ہے لیکن داتا صاحبؒ کی تاریخ ولادت کے ضمن میں اس نے بھی سکوت اختیار کیا ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا صحت سے بعید ہے کہ آپؒ ۵۴۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ہاں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ داتا صاحبؒ ۵۴۰۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ مولوی محمد شفیع مرحوم کے نزدیک داتا صاحبؒ کی ولادت چوتھی صدی ہجری کے اواخر یا پانچویں کے ابتدا میں ہوئی ہوگی۔ الغرض جب تک کوئی ٹھوس ثبوت

دستیاب نہیں ہوتا تب تک داتا صاحب کی تاریخ ولادت کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

✓ مولد

حضرت داتا صاحب کا مولد غزنی ہے جو اس زمانے میں دریا کے دونوں کناروں پر پھیلے ہونے کے باعث غزنویں (دو غزنی) کہلاتا تھا۔ داتا صاحب نے کشف المحجوب کے آغاز میں اپنا نام یوں لکھا ہے :

”علی بن عثمان بن ابی علی الحسلبانی الغزنوی ثم البجوری“

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کی ولادت جلاب (غزنی) میں ہوئی اور پھر ہجورہ میں منتقل ہو گئے۔ داراشکوہ نے وضاحت کی ہے کہ ”جلاب اور ہجورہ غزنی کے دو محلے تھے۔“

خاندان

حضرت داتا صاحب کا شجرہ نسب بھی ان کے دادا سے آگے صحت کیساتھ معلوم نہیں۔ پرانے تذکروں میں کچھ نہیں لکھا۔ داراشکوہ نے ذاتی تحقیقات سے ہماری معلومات میں تباہ اضافہ کیا ہے کہ ان کے ماموں جان کا لقب تاج الاولیاء تھا، اور یہ کہ سارا خاندان زہد و تقویٰ کے لئے مشہور ہے۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں لکھا۔

ایک صدی پہلے نور احمد چشتی نے مجادروں کی زبانی شجرہ نسب یوں لکھا ہے :

”حضرت علی گنج بخش بن سید عثمان بن سید علی بن سید

عبدالرحمن بن سید عبداللہ ہجوری بن سید ابوالحسن علی بن سید

حسن بن سید زید شہید بن حضرت امام حسن بن علی المرتضیٰؑ

اس طرح آپ کا شجرہ نسب نویں پشت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ زمانہ
حال کے تذکرہ نگاروں میں سے بعض نے سلسلہ نسب ائمہ واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر
ختم کیا ہے اور بعض بزرگوں کے ناموں میں بھی اختلاف کیا ہے۔^{۱۲}

روحانی نسبت

حضرت داتا صاحب امام اعظم کے معتقد تھے۔ ان کے مرشد شیخ ابوالفضل
محمد ابن حسن الحنفی تھے جن کے مرشد شیخ ابوالحسن الحصری تھے اور ان کے مرشد شیخ
شبلی تھے اور وہ ابوالقاسم حنیف بغدادی کے مرید تھے۔ یوں داتا صاحب کا حسب نامہ
بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ تاہم "کشف المحجوب" میں انہوں نے پہلے چاروں خلفاء
رضی اللہ عنہم کو طریقت کا امام بتایا ہے۔

"کشف المحجوب" کے ساتویں باب "فی ذکر ائمتہم من الصحابة رضی اللہ عنہم" کا آغاز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کیا ہے اور سب سے زیادہ تفصیلی
تذکرہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کیا ہے۔ کلام کا اختتام ان الفاظ پر کیا ہے کہ:
"وہ تمام مسلمانوں کے علما اور اہل طریقت کے خصوصاً
امام ہیں۔"

حضرت عمر فاروق کے بارے میں لکھتے ہیں:
"طائفہ صوفیاء گدڑی پہننے اور دین میں سختی کے بارے میں
آپ ہی کی اقتداء کرتا ہے۔"^{۱۵}
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذکر میں لکھا ہے:

"صوفیاء مال و جان کی قربانی، تسلیم و رضا اور عبادت کے
اخلاص میں آپ ہی کی اقتداء کرتے ہیں اور دراصل

حقیقت اور شریعت میں سب کے امام حق ہیںؑ
 حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے بیان میں فرماتے ہیں :
 ”طریقت میں آپ کی شان بڑی عظیم اور رتبہ بہت بلند
 ہے اہل طریقت ، عبادتوں میں پوشیدہ حقیقتوں
 اور اشاروں کے دقائق کو سمجھنے ، دنیا اور آخرت
 سے علیحدگی اور تقدیر حق پر نظر رکھنے میں آپ ہی
 کی اقتداء کرتے ہیں۔“

تعلیم و تربیت

حضرت داماد صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم کہاں اور کس سے حاصل کی؟ قدیم و جدید
 تذکرے اس سلسلہ میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتے۔ البتہ ثانوی تعلیم و تربیت کے
 بارے میں کشف المحجوب سے کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ داراشکوہ ہمیں بتا چکا ہے
 کہ داماد صاحب کا سارا گھرانہ علم کی دولت سے مالا مال تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے علم پرور گھرانے
 کے کسی ذہین و فطین فرزند کو ابتدائی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے گھر کی دہلیز سے
 باہر قدم رکھنے کی ضرورت پیش نہ آئی ہوگی۔

”کشف الاسرار“ نام کا ایک مختصر رسالہ حضرت داماد صاحب سے منسوب ہے ،
 اور یہ نسبت بنو زبیر ثبوت طلب ہے۔ تاہم اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ انہوں نے شیخ
 بزرگ کی فرمائش پر بارہ سال کی عمر میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اگر اس مشکوک رسالہ ...
 ”کشف الاسرار“ کی شہادت قبول نہ کی جائے تب بھی یہ امر مسلمہ ہے کہ داماد صاحب نے
 نوجوانی کے عالم میں ہی تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کر لیا تھا۔ ”کشف المحجوب“ کی
 ایک عبارت سے اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

”کشف المحجوب“ اخیر عمر کی تصنیف ہے۔ اس میں کئی جگہ تصنیف و تالیف کے ضمن میں اوائل عمر کے جوش و خروش اور غام خیالی پر معذرت خواہ دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ”پانچویں باب“ اختلاف فہم فی الفقر والصفوة ”میں فنا و بقاء کے مسئلہ پر علماء کی موثر گافیوں کو بے معنی عبارت آرائی اور ارباب لسان کی فضول باتیں قرار دے کر اقرار کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی ایک کتاب ”فنا و بقاء“ میں بچپن کے غلط اور احوال کی تیسری کے باعث اس انداز سے کچھ لکھا ہے لیکن اب اس کتاب ”کشف المحجوب“ میں پوری احتیاط سے اس کے احکام بیان کریں گے۔“

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ داتا صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت اس قدر جامع اور ہمہ گیر تھی کہ بچپن میں ہی ”فنا و بقاء“ جیسے پیچیدہ مسائل پر قلم اٹھانے لگے تھے

ماہر علوم

”کشف المحجوب“ کے سرسری مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت داتا صاحب، قرآن، حدیث اور تفسیر میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ شعر و ادب میں ان کے کمال کا ثبوت ان کا دیوان ہے جسے کسی بد بخت نے چرایا تھا۔ داتا صاحب نے دسواں پردہ کھولتے ہوئے مختلف علوم کی اصطلاحوں پر جو بحث کی ہے اس سے داتا صاحب کی ہمہ دانی کا اشارہ ملتا ہے۔ لکھتے ہیں :

”بعض اصطلاحات اہل لغت نے اپنے لئے مخصوص کر لی ہیں جیسے فعل ماضی۔ فعل مستقبل، صیغہ اور معتل، اجوف و لعیف اور ناقص و غنیہ۔ اہل نحو کی اپنی مخصوص اصطلاحیں ہیں — جیسے رفع و نمن۔ نصب و فتح۔ خفض و کسر۔ جزم و جر۔ اور منصرف و نامنصرف وغیرہ۔ اہل عروض کی بھی اپنی اصطلاحیں ہیں : جیسے

بحر و دوائر، سبب و تد اور فاصلہ و غیرہ۔ حساب دانوں نے
 اپنی اصطلاحیں مخصوص کر رکھی ہیں جیسے فرد و زوج۔ ضرب و تقسیم
 کعب و جذر۔ اضافت۔ تضعیف و تنصیف اور جمع و تفریق
 وغیرہ۔ اہل فقہ نے بھی بعض اصطلاحیں خود سے مخصوص کر لی ہیں۔
 جیسے علت و معلول۔ قیاس و اجتہاد۔ دفع و الزام و غیرہ
 محدثوں کی بھی مخصوص اصطلاحیں ہیں جیسے مسند و مرسل۔ احاد و
 متواتر۔ جرح و تعدیل وغیرہ۔ متکلمان نے بھی بعض اصطلاحیں
 مخصوص کر رکھی ہیں۔ مثلاً عرض و جوہر۔ کل و جزو۔ جسم و حدث
 اور تختیر و توالی وغیرہ۔^{۲۱}

اسی طرح کشف کی بعض عبارتوں سے علم طب اور کیمیا میں بھی درک رکھنے کے
 اشارے ملتے ہیں۔^{۲۲} داتا صاحب علوم کے تمام سمندروں کی غواشی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے
 تھے جو مرید کو بتایا :

”جان لو کہ علوم بہت ہیں اور انسان کی عمر کم ہے۔ اس لئے تمام
 علوم و فنون کا سیکھنا لوگوں پر فرض نہیں۔ مثلاً نجوم و طب۔ علم
 حساب اور علم بدیع کے منافع و غیرہ، تاہم ان میں سے ہر علم
 میں اتنا درک ہونا ضروری ہے کہ شریعت کے تقاضے کا حقیقہ
 پورے کئے جاسکیں یعنی علوم نجوم کا اتنا سیکھنا ہی کافی ہے۔ کہ
 رات کو وقت شناخت کر سکے۔ طب کی اتنی ہی ضرورت ہے، کہ
 نقصان سے بچ سکے۔ حساب اتنا ہی سیکھنا کافی ہے کہ وراثت
 کے مسائل کو سمجھ سکے اور مدت عدت کا حساب لگا سکے۔ غرضیکہ
 علم کا سیکھنا اسی قدر فرض ہے کہ بندہ اپنے اعمال درست

تصوف کی راہ پر

ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ داتا صاحبؒ نے ابتدائے تعلیم سے انتہائے علم تک، عالم سے محقق بننے تک اور تحقیق سے تصوف تک کے فاصلے کب اور کیسے طے کئے؟۔ بہر حال کشف المحجوب میں ڈوب کر بعض ایسے اشارات تلاش کئے جاسکتے ہیں جن کے سہارے یہ مفروضہ قائم ہو سکتا ہے کہ داتا صاحبؒ نے ایک عام دنیا دار سے مرجع خلائی صوفی بننے تک کے مراحل یک یک طے نہیں کر لئے تھے۔ بلکہ جملہ دنیاوی تجربات سے گزرنے کے بعد ہی دنیا داری سے توبہ کر کے تصوف کی طرف مائل ہوئے ہوئے تھے۔ دنیا داری کو ترک کر کے توبہ کرنے کا ذکر کشف المحجوب کے چودھویں باب میں آیا ہے جہاں آپؒ نے کرامت کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنا ایک ذاتی واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپؒ اوزکند سے فرغانہ کے گاؤں شلاک میں ایک بزرگ باب عسر کی زیارت کو گئے جو اوتاد کے مرتبہ پر فائز تھے۔ اس علاقہ میں بزرگ درویشوں اور مشائخ کو باب کہتے تھے۔ وہاں پہنچے تو باب عمر نے پوچھا :

”اے بچے! کس لئے آئے ہو؟“

داتا صاحبؒ نے جواب دیا : ”حنور کو ہمیشہ خود دیکھنے اور نظرِ کرم کی امید لیکر

آیا ہوں۔“

باب عمر نے کہا : ”میں تو تمہیں فلاں دن سے خود دیکھ رہا ہوں اور جب تک کوئی تجھے

مجھ سے غائب نہ کر دے تب تک تجھے دیکھتا ہی رہوں گا۔“

داتا صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے روز و سال کا حجاب لگایا تو یہ انکشاف ہوا

کہ باب عمر نے جس دن سے انہیں دیکھنے کا بتایا تھا وہ دن ان کی توبہ کا روز اول تھا۔ اس

بات کا پتہ چلانا مشکل ہے کہ داتا صاحبؒ کی زندگی کا یہ مبارک دور کب شروع ہوا تھا

دستیاب نہیں ہوتا تب تک دانا صاحب کی تاریخ ولادت کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

مولد

حضرت دانا صاحب کا مولد غزنی ہے جو اس زمانے میں دریا کے دونوں کناروں پر پھیلے ہونے کے باعث غزنویں (دو غزنی) کہلاتا تھا۔ دانا صاحب نے کشف المحجوب کے آغاز میں اپنا نام یوں لکھا ہے :

”علی بن عثمان بن ابی علی الحلبی الغزنوی ثم البجوری“

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کی ولادت جلاب (غزنی) میں ہوئی اور پھر ہجورہ میں منتقل ہو گئے۔ داراشکوہ نے وضاحت کی ہے کہ ”جلاب اور ہجورہ غزنی کے دو محلے تھے۔“

خاندان

حضرت دانا صاحب کا شجرہ نسب بھی ان کے دادا سے اُگے صحت کیساتھ معلوم نہیں۔ پرانے تذکروں میں کچھ نہیں لکھا۔ داراشکوہ نے ذاتی تحقیقات سے ہماری معلومات میں تباہ اضافہ کیا ہے کہ ان کے ماموں جان کا لقب تاج الاولیاء تھا اور یہ کہ سارا خاندان زہد و تقویٰ کے لئے مشہور ہے۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں لکھا۔

ایک صدی پہلے نور احمد پشی نے مجادروں کی زبانی شجرہ نسب یوں لکھا ہے :

”حضرت علی گنج بخش بن سید عثمان بن سید علی بن سید

عبدالرحمن بن سید عبداللہ ہجوری بن سید ابوالحسن علی بن سید

حسن بن سید زید شہید بن حضرت امام حسن بن علی المرتضیٰؑ

تاہم باب عمر کی طرف سے داتا صاحب کو بچہ کہہ کر مخاطب کرنے سے خیال گزرتا ہے کہ انھوں نے نوجوانی میں ہی یہ راہ اختیار کر لی تھی۔

جمع اموال

”کشف المحجوب“ کی ایک عبارت سے اشارہ ملتا ہے کہ طریق تصوف اختیار کرنے سے پہلے یا فوراً بعد داتا صاحب پر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا ہے جس میں آپ عراق کے کسی شہر میں مقیم تھے اور دولت جمع کرنے اور اسے بے دریغ خرچ کرنے میں مصروف تھے یہاں تک کہ کافی زیر بار بھی ہو گئے۔ ہر حاجت منداہنی کے در پر پہنچتا اور انہیں ہر کسی کی بے جودہ فرمائش پوری کرنے کے لئے تکلیف اٹھانا پڑتی۔

”ساداتِ وقت میں سے ایک سید نے مجھے خط لکھا: اے بیٹے! جو دل ہوا دہوس میں مشغول ہے اس کی خاطر تم اپنے دل کو خدا نے عز و جل سے نہ ہٹاؤ۔ ہاں اگر تم کسی ایسے دل کو دیکھو جو تمہارے دل سے گرامی تر ہو تو اس کو راحت دینے کے لئے بیشک اپنے دل کو مشغول کرو۔ ورنہ رک جاؤ کیونکہ بندوں کے لئے خدا کا فی^{۲۵} کافی ہے۔ چنانچہ مجھے فوراً اس کام سے فراغت ہو گئی“۔

شادی

حضرت داتا صاحب نے شادی کی تھی؟ اس کے بارے میں کوئی واضح شہادت دستیاب نہیں۔ تاہم آپ نے کشف المحجوب میں اپنی محبت کا ایک قصہ لکھا ہے جس سے یہ خیال قائم کرنے میں مدد ملتی ہے کہ آپ ساری عمر مجرد نہیں رہے۔ ”تزدیج و تحبریہ“ کے باب میں لکھتے ہیں:

”حق تعالیٰ نے مجھے گیارہ سال تک شادی کی اکت سے محفوظ رکھا لیکن اس فتنے میں مبتلا ہونا مقدر میں لکھا تھا۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہ تھا مگر اس کی جو صفات مجھ سے بیان کی گئیں انہیں سنکر میرا ظاہر اور باطن اسکا اسیر ہو گیا اور میں ایک سال تک اس کے خیال میں مستغرق رہا۔ نزدیک تھا کہ میرا دین تباہ ہو جائے کہ حق تعالیٰ نے کمال لطفت اور تمام فضل سے میرے دل بے چارہ پر رحمت کی اور اس سے خلاصی عطا فرمائی۔“

اس بیان کا تجزیہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذاتا صاحب نے شادی کی تھی۔ مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر مٹا ہلی زندگی سے آزاد ہو گئے۔ مذکورہ واقعہ اس رہائی کے گیارہ سال بعد پیش آیا۔ چونکہ آپ اس وقت صوفیانہ زندگی اختیار کر چکے تھے لہذا اس نادیدہ محبوب سے اپنے دین کی تباہی کا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ یہاں دین طریقت کے معنوں میں آیا ہے۔

اولاد

ذاتا صاحب نے خود یا ان کے کسی تذکرہ نویس نے اولاد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ آپ کی کنیت ابو الحسن تھی۔ کشف المحجوب ص ۱۷۷ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت خواجہ مظفر نے ذاتا صاحب کو ابو الحسن کی کنیت سے یاد کیا ہے۔ یہ کنیت آپ کے شادی شدہ اولاد صاحب اولاد ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں۔ کہ بعض بزرگوں نے فرضی کنیت بھی اختیار کی ہے لیکن مندرجہ بالا واقعہ میں پہلی شادی کی طرف اشارہ موجود ہونے کے باعث اس کنیت کو فرضی نہیں سمجھنا چاہیے۔

لباس

حضرت داتا صاحب ایک کامل صوفی ہونے کے باوجود لباس کے معاملہ میں آزاد تھے۔ صوفیوں کی تقلید میں لازمًا صوف یا گدڑی نہیں پہنتے تھے، بلکہ جو کچھ میسر آتا پہن لیتے تھے۔ کشف المحجوب کے چوتھے باب میں مرقع (گدڑی) کو صوفیاء کا شعار اور سنت نبوی قرار دیا ہے اور پھر صوفیا کے لئے گدڑی کی ضرورت پر میر حاصل تبصرہ نے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو جب حصول جاہ کا اور کوئی ذریعہ نہیں ملتا گدڑی پہن لیتے ہیں اور فقیہانہ گدڑی کے ذریعے سرداری اور عزت و توقیر طلب کرتے ہیں۔ اسی باب میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

”صوفیہ کے ایک گروہ نے لباس کے بارے میں تکلف روا نہیں رکھا۔ اگر خدا تعالیٰ نے انہیں عبادی توپہن لی، اگر قبادی توپہن لی اور اگر برہمنہ رکھا تو اسے قبول کیا میں کہ علی بن عثمان الحبلا بی ہوں۔ یہی طریقہ پسند کرتا ہوں اور اسی کو اپنا شعار بنایا ہے۔“

علمی تحقیق

داتا صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزرا۔ اس کے باوجود سفر و حضر میں تحقیق و تصنیف اور درس و تدریس کے مشاغل جاری رکھے۔ آپ نے علمی تحقیق کے لئے جو مصیبتیں اٹھائی ہیں، ان کا ذکر کشف المحجوب میں کئی جگہ ملت ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آپ کا ہر سفر حصول علم یا کسی علمی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لئے ہوتا تھا۔ مثلاً اقامت میں صحبت کے ادواب کے باب میں لکھتے ہیں کہ :

ایک دفعہ میں نے دو درویشوں کے ساتھ ابن المعلا کی

زیادت کے لئے دمشق سے رملہ کا قصد کیا۔ راستے میں ہم نے طے کیا کہ ہر شخص دل میں کوئی ایسی بات سوچ لے جس کا حل درکار ہو تاکہ وہ پیر سہارے یا طن سے مطلع ہو کر وہ عقدہ حل کر دیں۔ میں نے کہا کہ ان سے حسین (بن منصور) الحلاج کے اشعار و مناجات کی درخواست کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں دعا کر اؤں گا کہ میرا مرض طحال جاتا رہے۔ تیسرے نے کہا کہ میں حلوائے صابونی کھانا چاہوں گا جب ہم وہاں پہنچے تو انھوں نے حکم دیا کہ وہ جزو میرے سامنے رکھ دیا جائے جس میں حسین کے اشعار و مناجات لکھے تھے دوسرے درویش کے پیٹ پر ہاتھ پھیر دیا جس سے اس کی تلی کم ہو گئی اور تیسرے سے فرمایا کہ صابونی حلوہ تو سپاہیوں (عوانوں) کی غذا ہے تو نے اولیاء کا لباس پہن رکھا ہے اولیاء کے لباس میں سپاہیوں کی طلب دست نہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لو۔

اسی طرح حسین بن منصور الحلاج کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ : —

”میں نے ان کی پچاس تصانیف بغداد اور اس کے نواح میں دیکھی ہیں اور بعض نسخے خوزستان اور فارس اور خراسان میں“

اسی طرح فرقہ سیاریہ کے بیان میں اپنے تحقیقی ذوق کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے ابوالعباس سیاری کے مذہب کے سوا کوئی مذہب تصوف میں اپنے حال پر قائم نہیں رہا۔ نسا میں رہنے والے سیاریوں نے مرو کے سیاریوں

کو کچھ عمدہ رسائل اور خطوط لکھے :

" میں نے ان خطوط میں سے بعض کو مرو میں خود دیکھا ہے جو

بہت خوب ہیں اور ان کا موضوع جمع و تفرق ہے " ^{۳۲}

اسی طرح ابویزید سے ایک سوال کے بارے میں لکھا ہے کہ لوگوں نے ان سے

پوچھا کہ آپ کی عمر کتنی ہے ؟ تو آپ نے فرمایا " چار سال " داتا صاحب اپنی تحقیق

بتاتے ہیں کہ ایک نسخہ میں ہے کہ " چالیس سال " ^{۳۳}

ذاتی ذخیرہ کتب

داتا صاحب نے اس تحقیقی ذوق کے باعث کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر

لیا تھا۔ ان میں آپ کی ذاتی کتابیں بھی ہیں اور دوسروں کی لکھی ہوئی بھی۔ داتا صاحب

نے کشف المحجوب میں مختلف مقامات پر اپنی نو تصنیفات کا حوالہ دیا ہے۔ ان میں

دو کتابیں ایسی ہیں جنہیں کسی ادبی چور نے اپنے نام کر لیا تھا۔ ان پر تفصیلی بحث، داتا

صاحب کی تصنیفات کے باب میں کی جائے گی۔ یہاں صرف داتا صاحب کے ذاتی

ذخیرہ کتب کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ " کشف المحجوب " میں داتا صاحب نے دوسرے

مصنفوں کی کم و بیش بیس کتابوں کے حوالے پیش کئے ہیں۔ کشف المحجوب میں سلیم

الرائی کے تذکرہ میں داتا صاحب نے بصد حسرت لکھا ہے کہ :

" اس وقت اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں کیونکہ میری کتابیں

غزنین عرسما اللہ میں رہ گئی ہیں " ^{۳۵}

اسے ہماری بد قسمتی کہہ لیجئے کہ زمانے کے الٹ پھرنے اس ذخیرے کو اس

طرح منتشر کیا ہے کہ آج ہمیں داتا صاحب کی تصنیفات میں سے " کشف المحجوب "

کے سوا کچھ دستیاب نہیں۔

دعوت و ارشاد

دانا صاحب عبادات، تحقیق اور تصنیف و تالیف کے اشغال کے ساتھ مستند ارشاد بھی اُراستہ کرتے تھے اور علمی مسائل پر بحث و مناظرے کیلئے بھی وقت نکال لیا کرتے تھے۔ مبتدیوں کو تعلیم دینے کا ایک اشارہ زکوٰۃ کے باب میں ملتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

”اس زمانہ کی خرابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ نیکی اور فقر کے مدعی اپنی جہالت سے علم کو ترک کر دیتے ہیں ایک دفعہ میں مبتدی صوفیوں کی ایک جماعت کو صدقہ کے مسائل سکھا رہا تھا کہ ایک جاہل آگیا، اس وقت اونٹ کے دو۔ تین اور چار سالہ بچے کی زکوٰۃ زیر بحث تھی۔ وہ جاہل ان باتوں سے اکتا کر کہنے لگا کہ میرے پاس تو کوئی اونٹ نہیں کہ یہ علم مجھے درکار ہو۔ میں نے کہا اے شخص اگر کسی کے پاس مال نہ ہو اور مال کی ضرورت بھی نہ ہو تب بھی علم کی فرضیت اس سے ساقط نہیں ہوتی۔“

مناظرے

”کشف المحجوب“ میں کئی جگہ علمی مسائل پر متناظرہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً پہلے

باب میں مذہب سوفسطائیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

”ایک دفعہ میرا اہل علم میں سے ایک شخص سے مناظرہ ہوا جس نے کلام غرور کا نام عزت اور خواہش

نفس کی متابعت کا نام سنت رسولؐ اور شیطان کی موافقت کا نام ائمہ دین کی سیرت رکھا ہوا تھا۔ اثنائے مناظرہ میں اس نے کہا کہ محدین کے بارہ گروہ ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ اہل تصوف کا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایک گروہ اہل تصوف ہیں تو گیارہ گروہ تم لوگوں کے ہیں، اہل تصوف ایک گروہ ہو کر بھی جس طرح اپنی حفاظت کر سکتے ہیں تم گیارہ ہو کر بھی اس طرح اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے سوانح حیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
 ” ایک دفعہ غزنین عرسھا اللہ میں ایک شخص نے جو امامت اور علم کا مدعی تھا کہا کہ گدڑی پہننا بدعت ہے۔ میں نے کہا کہ عشیشتی اور دبیقی جو ریشمی کپڑے ہیں اور جن کا پہننا مردوں پر حرام ہے اور ظالموں کے مال سے جو حرام مطلق ہے، اہ و زاری کر کے حاصل کرنا تو اور بھی حرام ہے۔ تم اسے تو بے تکلف سے لیتے اور پہن لیتے ہو، اور محبول کر بھی نہیں کہتے کہ یہ بدعت ہے لیکن ایک حلال کپڑا جو حلال کمائی سے خریدا گیا ہے تم اسے بدعت کہتے ہو۔“

اسی طرح ہندوستان میں ایک مناظرہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :-

”تفسیر و تذکر اور علم کے ایک مدعی نے فنا و بقا کے مسئلہ پر مجھ سے مناظرہ کیا۔ جب میں نے خوب غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ شخص نہ تو فنا کو پہچانتا ہے اور نہ ہی بقا کو جانتا ہے اور نہ قدیم و حادث میں فرق کر سکتا ہے۔ جاہلوں میں اس قسم کے لوگ بہت ہیں“

امامت و خطابت

”کشف المحجوب“ کی بعض عبارتوں سے داتا صاحب کے امامت و خطابت فرمانے کے اشارے بھی ملتے ہیں۔ دارالاشکوہ نے بتایا ہے کہ داتا صاحب نے ایک مسجد خود تعمیر کی تھی جسکا محراب دوسری مساجد کی بہ نسبت قدرے جنوب کی طرف مائل تھا۔ علمائے وقت نے اس پر اعتراض کیا تو ایک دن داتا صاحب نے سب معتزین کو جمع کر کے امامت فرمائی اور بعد نماز پوچھا کہ اب دیکھو کعبہ کس طرف ہے؟ تمام حجابات درمیان میں سے اٹھ گئے تھے اور کعبہ سامنے نظر آ رہا تھا۔ کشف المحجوب میں نماز کے باب میں اسی ضمن میں یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ: ”قبلہ“ ظاہر کعبہ ہے اور قبلہ باطن عرش معلیٰ“

وفات

حضرت داتا صاحب کی تاریخ ولادت کی طرح تاریخ وفات بھی ٹھیک سے معلوم نہیں ہے۔ اس ضمن میں تذکرہ نویسوں کے بیانات اس قدر مختلف اور متضاد ہیں کہ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا محال ہے۔ معروف و مقبول قول کے مطابق داتا صاحب

کی تاریخ وفات ۲۰ صفر ۸۶۵ھ بمطابق ۵ نومبر ۱۴۶۳ء ہے۔ آپ کا عرس بھی ہر سال ۲۰ صفر کو منایا جاتا ہے اور مزار کے موجودہ کتبہ پر بھی یہی تاریخ لکھی ہے، یہ تاریخ کیسے متعین ہوئی؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنا محال ہے۔ داتا صاحب کا سب سے قدیم تذکرہ "نجات الانس" مرتبہ نور الدین جاتی ہے جو ۸۸۳ھ / ۱۴۷۸ء میں مکمل ہوا۔ اس میں داتا صاحب کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کے ضمن میں مکمل سکوت اختیار کیا گیا ہے۔^{۲۲} ایٹن کبیری میں بھی وفات کے سال کی صراحت نہیں کی گئی۔^{۲۳} البتہ "ثمرات القدس" مؤلفہ نعل بیگ بخشی میں پہلی مرتبہ سال وفات کی صراحت ملتی ہے۔ اس نے ایک عجیب و ناقابل فہم کہانی سنائی ہے کہ داتا صاحب چالیس بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن بچوں کی شوخی بہت ناگوار گزری اور منع کرنے پر بھی وہ شرارت سے باز نہ آئے تو داتا صاحب نے بد دعا دی۔ جس سے وہ سب مر گئے۔ پھر افسوس ہوا تو اپنے وصال کی بھی دعا کی، جو مقبول ہوئی اور یہ واقعہ سن چار سو چھپن میں پیش آیا۔ داتا صاحب کے تذکرہ کے سب سے مقبول ماخذ "سفینۃ الاولیاء" مؤلفہ شہزادہ داراشکوہ میں وفات کے بارے میں دو مختلف اقوال رقم کئے گئے ہیں ایک قول کے مطابق وفات چار سو چھپن میں ہوئی۔ یہ تاریخ "ثمرات القدس" سے مطابقت رکھتی ہے۔ دوسرے قول کے مطابق داتا صاحب کا سن وفات ۸۶۴ھ لکھا ہے لیکن پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں داراشکوہ کے قلم سے لکھے ہوئے جس نسخے کا عکس موجود ہے اس میں سن چار سو لکھ کر آگے جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔^{۲۵} "کشف الظنون" میں حاجی خلیفہ نے اور قاموس الاعلام میں سامی بیگ نے سن وفات ۸۶۵ھ ہی لکھا ہے۔^{۲۶}

"نغمۃ الاصفیاء" میں مفتی غلام سرور نے سفینۃ الاولیاء سے وفات کی جو

تاریخیں نقل کی ہیں وہ سمتیتہ الاولیاء کے مطبوعہ نسخہ (نولکسٹور) سے مختلف ہیں۔
 تاہم انہوں نے اپنی رائے یہ بتائی ہے کہ داتا صاحبؒ نے ۴۶۵ھ میں وفات پائی۔
 مفتی صاحب نے اپنے اس فیصلہ کو "نفحات الانس" پر مبنی قرار دیا ہے۔ — حالانکہ
 "نفحات الانس" کا غالباً سب سے قدیم نسخہ مولوی محمد شفیع مرحوم کے پاس تھا، لیکن
 اس میں اور مطبوعہ نسخوں میں ولادت اور وفات کے سنوں کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔
 "تحقیقات حشری" میں مولوی نور احمد حشری نے داتا صاحب کے سال وفات
 کے ضمن میں جامی، داراشکوہ اور مفتی غلام سرور کی بیان کردہ تاریخیں نقل کر دی
 ہیں اور ان میں مفتی غلام سرور صاحب کے ایک خط کے مطابق سن ۴۶۵ھ
 کا اضافہ کیا ہے۔^{۴۹}

"ناثر الکرام" مولفہ آزاد بلگرامی اور "حدائق الخفیہ" میں بھی سال وفات :
 ۴۶۵ھ ہی دیا ہے۔ "نزهت الخواطر" مولفہ عبدالحی میں بھی ۴۶۵ھ دیا گیا ہے
 لیکن نہ جانے کس سن کی بنا پر ماہ وفات صفر کے بجائے ربیع الاول قرار دیا،
 ہمارے زمانہ کے ممتاز تذکرہ نویسوں میں سے ہدایت حسین نے دائرۃ المعارف
 اسلامی میں،^{۵۲} مولانا عبدالمجید دریا آبادی نے "تصویر اسلام" میں۔^{۵۳} سید
 صباح الدین عبدالرحمن نے "بزم صوفیہ" میں اور شیخ محمد اکرام نے "آب کوثر" میں
 داتا صاحب کا سال وفات ۴۶۵ھ قرار دیا ہے۔

۵ سال وفات کی تحقیق

مذکورہ علماء کے برعکس عہد حاضر کے بعض علماء نے ۴۶۵ھ کو سال وفات
 ملنے سے انکار کیا ہے اور اس کی بنیاد "کشف المحجوب" کی داخلی شہادتوں پر رکھی
 ہے۔ پروفیسر نکلسن نے کشف المحجوب کے انگریزی ترجمہ (۱۹۱۱ء) کے دیباچہ
 میں لکھا کہ :

"دانا صاحب نے کشف المحجوب" میں صوفیائے متاخرین
 کے اماموں کے ضمن میں بتایا ہے کہ — "اس باب میں
 جن صوفیاء کا حال رقم کر رہا ہوں ان میں سے بعض تو
 وفات پا چکے ہیں اور بعض ابھی تک زندہ ہیں — لیکن
 جن دس صوفیاء کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے صرف
 ایک یعنی ابوالقاسم گرگانی کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے
 جس سے کتاب کے زمانہ تالیف میں ان کے بقید حیات
 ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ سفینۃ الاولیاء میں
 گرگانی کی وفات ۵۸۵ھ / ۱۱۹۰ء بتائی گئی ہے اگر
 یہ تاریخ درست ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ کشف
 المحجوب قشیری کی رحلت سے کم از کم پندرہ سال پہلے
 لکھی گئی ہوگی۔ دوسری طرف "شذرات الذهب" کے
 قلمی نسخہ میں جو میرے پاس ہے ابوالقاسم گرگانی کی
 رحلت ۵۶۹ھ / ۱۱۷۴ء کے سال میں مندرج ہے اور
 مجھے یہ تاریخ زیادہ قرین قیاس لگتی ہے اور اس طرح
 یہ بیان بھی قابل قبول ہو جائے گا کہ مصنف (دانا صاحب)
 قشیری کے بعد بھی زندہ رہے۔ قشیری کے بعد تک زندہ
 رہنے کا بیان منعی شہادت پر مبنی ہے کیونکہ ہم اس
 امر پر زیادہ زور نہیں دے سکتے کہ کشف المحجوب میں
 بعض جگہوں پر قشیری کے نام کے آگے "رحمۃ اللہ علیہ" لکھا
 ملتا ہے (لہذا وہ لازماً زمانہ تالیف کشف میں انتقال کر چکے

تھے، میرا خیال ہے کہ مصنف کی رحلت ۵۶۶۵ھ / ۱۰۷۲ء اور ۵۶۶۹ھ / ۱۰۷۶ء کے درمیان ہوئی ہوگی۔

اس کے بعد مولوی محمد شفیع مرحوم نے اس آخری تاریخ میں مزید دس سالوں کا اضافہ کر دیا۔ لکھتے ہیں :

”بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ (علی ہجویری) اس (۵۶۶۵ھ) سے کئی سال بعد تک زندہ رہے۔“
پھر دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

”مفصل بحث کا یہ مقام نہیں۔ صرف یہ کہنا کافی ہے، کہ حضرت داماد صاحب نے کشف المحجوب میں متعدد شیوخ کا ذکر بصیغہ ماضی کیا ہے مثلاً کہا ہے کہ فلاں بزرگ زہد تقویٰ اور صلاحیت میں ایسے ایسے تھے۔ اب ان بزرگوں کی وفات کی تاریخیں دیکھیں تو وہ ۵۶۶۰ھ / ۱۰۶۷ء سے — ۵۶۷۹ھ / ۱۰۸۶ء تک پہنچتی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ حضرت شیخ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جناب ہجویری کی وفات ۵۶۷۹ھ / ۱۰۸۶ء یا اس کے بعد ہوئی ہوگی۔“

مولانا علم الدین سالک مرحوم نے مولوی محمد شفیع کے بیان میں یہ اضافہ کیا ہے کہ :
”کشف المحجوب“ میں بعض بزرگوں کے لئے ماضی بعید کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب مذکورہ کی تصنیف کے وقت یہ بزرگ دنیا سے

رخصت ہو چکے تھے۔ ان میں امام ابوالقاسم قشیری (المتوفی ۵۶۶۵ھ / ۱۰۷۲ء) —
ابوالحسن سالبہ (المتوفی ۵۶۷۳ھ / ۱۰۸۰ء) — ابوعلی فارمدی (المتوفی ۵۶۷۷ھ / ۱۰۸۴ء)

شیخ عبد اللہ انصاری ہروی (المتوفی ۱۲۸۱ھ / ۱۰۸۸ء) خاص طور پر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ان کے حالات اور سنین پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کشف المحجوب ۱۲۸۱ھ / ۱۰۸۸ء کے بعد مکمل ہوئی اور آپ اس کے بعد بھی زندہ رہے اس لئے آپ کی وفات کا زمانہ : ۱۲۸۵ھ / ۱۰۹۲ء اور ۱۲۵۰ھ / ۱۱۰۶ء کے درمیان تعین کیا جاسکتا ہے اور زیادہ اغلب یہی ہے کہ آپ ۱۲۵۰ھ / ۱۱۰۶ء کے آغاز میں فوت ہوئے ہوں۔

اقتانے عبد الحی حبیبی نے خاص تاریخ وفات کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے، انہوں نے بھی کشف المحجوب میں بعض بزرگوں کا ذکر صیغہ حال ماضی بعید میں آنے پر اپنے استدلال کی عمارت تعمیر کی ہے مثلاً : "استاد ابوالقاسم قشیریؒ اندر زمانہ خود بدیع بود"۔ شیخ اشیرؒ ابو الفتح سالہ افصح اللسان بود"۔ "ابو علی فضل بن محمد فارسی کا ذکر "ابقاہ اللہ" کے دعائیہ جملہ کے ساتھ فرماتے ہیں "۔ شیخ سہیل کی کا ذکر یوں کیا ہے : امام اک دیار بود و دی را خلقے نیک بود"۔ الشقاق کی بابت ان کے الفاظ یہ ہیں : "مرا با دی انسی عظیم بود اندر بعض علوم استاد من بود"۔ الشقاق نے سن ۱۲۷۹ھ / ۱۰۸۶ء میں وفات پائی اور صیغہ بود سے ظاہر ہے کہ حضرت، بحوری ۱۲۷۹ھ / ۱۰۸۶ء کے بعد بھی بقید حیات تھے۔ اس کے بعد حبیبی نے دانا صاحب کی عمر کو ۱۲۸۱ھ / ۱۰۸۸ء سے آگے لے جانے کے لئے خواجہ عبد اللہ انصاریؒ کے نام پر رحمتہ اللہ لکھے ہونے پر انحصار کیا ہے اور پھر ۱۲۵۰ھ / ۱۱۰۶ء سے پہلے کشف المحجوب کے مکمل ہو چکنے کے حق میں شیخ قسورہؒ گرویزی کا ذکر بصیغہ حال "بریک را بنزدیک وی حرمتی ہست و مشائخ را دیدہ است" کو دلیل بنایا ہے۔ حبیبی کے دلائل میں صرف یہی کمزور کڑی ہے کہ انھوں نے خواجہ عبد اللہ انصاریؒ کے نام پر "رحمتہ اللہ علیہ" لکھے ہونے پر انحصار کیا ہے۔

یہ طرز استدلال سب سے پہلے دیونے "برٹش میوزیم میں فارسی مخطوطات کی
 فہرست" جلد اول صفحہ ۳۷۳ پر اختیار کیا تھا لیکن نکلسن نے ۱۹۱۱ء میں ہی اسے ناقابل
 اعتنا قرار دے دیا تھا۔^{۶۶} مجید زردانی نے بھی اس طرز استدلال کے منصف پر بحث کرتے
 ہوئے لکھا ہے کہ اگر کسی بزرگ کے نام کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ کی موجودگی ان کی
 رحلت کا ثبوت ہو سکتی ہے تو پھر اس کی کیا توجیہ کی جائے گی کہ کشف المحجوب کے آغاز
 میں اپنے نام کے آگے بھی رضی اللہ عنہ اور دوسری جگہوں پر رحمتہ اللہ علیہ لکھا ہے
 لہذا کسی نام کے آگے رضی اللہ عنہ لکھے ہونے سے اس کا وقت ہو چکا ہونا ثابت نہیں
 ہوتا۔^{۶۷} آقا جیبی اور محترم زردانی نے اس نکتے کو ملحوظ نہیں رکھا کہ کون کہہ سکتا
 ہے کہ "کشف المحجوب" میں اپنے یا بزرگوں کے ناموں پر رح اور ضرور داتا صاحب
 نے لکھے ہوں گے۔ ابھی تک داتا صاحب کے قلم کا یا ان کی حیات کے زمانے کا لکھا ہوا
 کوئی بھی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ فی الوقت "کشف المحجوب" کا سب سے پرانا مخطوطہ
 وہ ہے جو مولوی محمد شفیع مرحوم کے ذاتی کتب خانہ میں ہے۔^{۶۸} ماسکوا بڈیشن کے مدون کو
 اس کی موجودگی کا علم تھا۔ لیکن اسے یا نکلسن کو اس سے استفادے کا موقع نہیں ملا۔
 یہ نسخہ ۶۶۴ھ / ۱۲۵۶ء میں لکھا گیا تھا اور اس کی صحت کا سب سے بڑا ثبوت یہ
 ہے کہ یہ حضرت بہار الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۶۶ھ / ۱۲۶۷ء) جیسے
 ولی کامل کا نقل کردہ ہے۔ یہ یہودی نہیں سکتا کہ حضرت بہار الدین زکریا ملتانی رح یا ان سے کہیں کمتر
 درجے کا کوئی شخص دو ڈھائی سو سال بعد "کشف المحجوب" کی نقل تیار کرے تو جن بزرگوں
 کا نام آئے ان پر رضی اللہ عنہ یا رحمتہ اللہ علیہ کا اضافہ نہ کر دے۔ لہذا ان کلمات کی
 موجودگی سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ کشف المحجوب کے اصل نسخہ میں یہ کلمات موجود تھے انہیں
 نقل نویس کی اذات کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اس سناری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اگر داتا صاحب کا سال
 وفات معلوم کرنے کیلئے کشف المحجوب کی داخلی شہادتوں پر انحصار کرنا ہو تو پھر صیغہ حال ماضی بعید
 ہی کو قابل قبول مانا جاسکتا ہے اور یوں داتا صاحب کا سال وفات ۶۸۱ھ سے آگے لیجا یا نہیں جاسکتا

⑦ مزار

دانا صاحب کا مزار صدیوں سے مرجع خلایق ہے۔ ہر زمانے میں اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اب محکمہ اوقاف کے زیر اہتمام مزار کی توسیع اور آرائش کا سلسلہ شروع ہے مزار کا دروازہ لاکھوں روپے کے خرچ سے ایران سے بن کر آیا ہے ان تعمیرات کے بعد دانا صاحب کا مزار بالکل مختلف دکھائی دے گا۔

روایات کے مطابق دانا صاحب کا مزار سب سے پہلے سلطان ابراہیم نے تعمیر کرایا تھا۔ تحقیقات چشتی کے مطابق آج سے ایک صدی پہلے مزار کا نقشہ یوں تھا :

”مزار سنگ مرمر کے چبوترہ پر ہے سنگ مرمر پر سنگین گلکاری کی گئی ہے۔ مزار کے دو درجے ہیں۔ پہلا درجہ دو فٹ اونچا ہے اور دوسرا اس سے ایک فٹ بلند ہے اور اس پر تعویذ مزار ہے۔ سطح یہ کہ مزار ڈھائی گز طویل اور سات گز عرض ہے ایک ہی پتھر کا بنا ہوا ہے۔ خدا جانے سنگ مرمر کا وہ تختہ کتنا بڑا ہوگا جس سے یہ تعویذ نکالا گیا ہے۔ چبوترے پر لکڑی کا ایک ہشت پہلو پنجرہ ہے جو ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فیل بان میاں عیوض خاں نے بنوایا تھا۔ ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں نور محمد سادھو نے لکڑی کے

پنجرہ کے اوپر ایک گنبد تعمیر کرایا ہے۔ میڈیکل کالج (لاہور) کے ڈاکٹر محمد حسین نے چادروں طرف اُٹھنے لگوائے ہیں۔“

”تحقیقاتِ چشتی“ کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۶۱ء سے پہلے مزار پر گنبد نہیں تھا۔ بعد ازاں مولوی فیروز الدین مرحوم نے ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں عیوض خاں کے چوبی پنجرہ کی جگہ سنگ مرمر کے ستون اور جالیاں لگوائیں۔ اور نور محمد سادھو کے گنبد کی جگہ سبز روغنی ٹائلوں سے نیا گنبد بنوایا۔

داتا صاحبؒ نے اپنے زمانہ میں جو مسجد بنوائی تھی اور جس کے درخ قبہ کے بیڑے بن پر علمائے لاہور نے اعتراض کیا تھا، اب باقی نہیں، البتہ جہاں داتا صاحب کی مسجد کا محراب تھا۔ وہاں سنگ سیاہ سے نشان لگا دیا ہے جو جدید مسجد کے صحن میں مزار کے قریب ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسجد زیادہ بڑی نہ تھی۔ تحقیقاتِ چشتی کی روایت ہے کہ داتا صاحب نے جو مسجد بنوائی تھی اس پر گنبد نہ تھے، صرف لکڑی کی چھت تھی۔ اس کتاب کی تالیف کے زمانہ ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں گلزار شاہ سادھو نے سابقہ بنیادوں پر نئی مسجد تعمیر کرائی اور اس پر گنبد بھی بنوائے۔ ہمارے قریبی زمانہ میں لکڑی کے ایک ٹھیکیدار نے زرخیر صرف کر کے پرانی مسجد کی جگہ نئی مسجد تعمیر کرائی۔ اس مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں علامہ اقبال مرحوم نے جو قطعہ لکھا تھا اس کا مرمرین کتبہ مسجد کی مشرقی دیوار میں نصب تھا۔ محکمہ اوقاف نے مزار کی توسیع کے لئے یہ دیوار گرا دی ہے۔ نہ جانے علامہ اقبال کے یادگار تاریخی کتبے کا کیا بنا ہے!

داتا صاحبؒ کے مزار کے ارد گرد والان تھے جو مختلف اوقات میں مختلف اصحاب نے تعمیر کرائے۔ چشتی کے بقول نواب خان خاناں نے سنگ سیاہ کا ایک سہ درہ والان بنوایا تھا جو کتاب کی تالیف سے ایک صدی پہلے یعنی ۱۷۶۸ء کے

نواح میں ایک زلزلہ کے باعث منہدم ہو گیا تھا۔ اسے رنجیت سنگھ کے مختار ٹکسال محمد خاں نے پختہ اینٹوں سے دوبارہ تعمیر کرایا۔ چشتی نے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے بنوائے ہوئے دالان، نشست گاہ اور چار دیواری کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کی مرمت راجہ رنجیت سنگھ نے کرائی تھی۔

خواجہ جمیر کا حجرہ اعتکاف

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے داتا صاحبؒ کے مزار پر جس جگہ چلہ کشی کی تھی وہاں اکبر نے ایک کمرہ بنوایا۔ چشتی کے زمانہ میں اس کمرے کے اوپر گنبد تھا، اور اندر جانے کے لئے لکڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔

قرآن حکیم کے نادر نسخے

مزار داتا گنج بخشؒ کی ایک خاص چیز قرآن مجید کے وہ نسخے تھے جو مختلف اوقات میں مختلف لوگوں نے پیش کئے تھے۔ مؤلف تحقیقات چشتی نے شمالی دالان کے متعلق بتایا ہے کہ اسے بھائی میرا صاحب کنور نول سنگھ نے بنوایا تھا۔ مگر رانی چند کور نے اور زمین شامل کر کے دالان کو کشادہ کرایا اور اوپر چھت ڈلوائی۔ اس دالان میں ... قرآن شریف رکھے رہتے کہ عقیدت مندان کی تلاوت کریں۔ چار قرآن شریف ایسے ہیں جن کے ہر پارہ کی جلد علیحدہ ہے۔ ان میں سے ایک موریاں، داسٹہ رنجیت سنگھ نے ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں پیش کیا تھا۔ ایک نادر نسخہ وہ تھا جسے نظام حیدر آباد دکن مومن الملک علاء الدولہ جعفر خاں نصیر بہادر نامہ جنگ نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰-۲۱ء میں پیش کیا تھا، اور اس کی تلاوت کے لئے اپنے خرچ پر ایک قادی بھی مستر کیا تھا۔ بڑی بڑی رحلوں پر سات قرآن شریف ایسے رکھے ہیں جو بہت بڑے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا طول ایک گز اور عرض دس گز ہے۔

چار نسخے ان سے چھوٹے ہیں مگر وہ بھی دس گروہ طول کے ہیں۔
 ایک قرآن بہت پرانا ہے جو بہاری خط میں مشک کے ساتھ لکھا گیا ہے۔
 اسی طرح خط ثلث میں لکھا ہوا ایک نہایت پرانا نسخہ موجود ہے۔ ایک خط طغائی میں
 لکھا گیا ہے اور نواب ملتان کا ہدیہ ہے، افسوس کہ یہ بیش بہا تاریخی ذخیرہ، بعض
 نااہل سرکاری ملازموں کی نالائقی سے ضائع ہو چکا ہے۔ جب محکمہ اوقاف نے داتا
 صاحب کے مزار کو اپنی تحویل میں لیا تو کسی نالائق افسر نے یہ سارے قلمی نسخے بوریوں میں
 باندھ کر راوی میں بہا دینے کے لئے بھیج دیئے۔ تاہم بعض اجزاء دریا برد ہونے سے
 بچ گئے اور نوادر کے شیدائی فقیر سید معین الدین مرحوم کے ہاتھ لگ گئے، اور
 یوں محفوظ ہو گئے۔ مرحوم نے اس تاریخی خزانے کے اتلاف کی کہانی بحیثیت نم سنائی اور بچے
 ہوئے اجزاء دکھائے جن میں سے ایک تو یقیناً اکبری دور کی خطاطی کا نمونہ ہے۔ اگر یہ
 خزانہ نالائق اہلکاروں کے ہاتھ نہ لگتا تو آج دارالقرآن میں سجا ہوتا اور اسے دنیا میں فرد
 بنا دیتا۔

متولی

روایت ہے کہ داتا صاحب کے ہاتھ پر پنجاب کے حاکم رٹے راجو نے اسلام قبول
 کیا۔ داتا صاحب نے اس کا اسلامی نام نہ جانے کیا رکھا مگر وہ شیخ ہندی کے نام سے مشہور
 ہوا۔ مزار کی خدمت اور مجاوری اسی کے خاندان سے مخصوص چلی آتی ہے۔

شیخ ہندی کی بارہ پشتوں تک ایک ہی فرزند ہوتا رہا۔ تا آنکہ اکبر کے عہد میں شیخ
 لطف اللہ کے ہاں ایک سے زیادہ فرزند ہوئے اور یہ روایت ٹوٹ گئی۔ مزار کی آمدنی
 تمام مجاوروں میں برابر بٹ جاتی۔ جس دن کوئی بچہ پیدا ہوتا، اسکا حصہ جاری ہو جاتا ہے
 اور جس دن کوئی فوت ہوتا ہے اسکا حصہ بند ہو جاتا ہے۔

۱۹۵۹ء میں محکمہ اوقاف نے مزار کو اپنی تحویل میں لیا تو مجاوروں کو مزار کی آمدنی

نظم و نسق اور رسومات کی ادائیگی سے محروم کر دیا۔ ۱۹۷۴ء میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ مزار کی آمدنی بے شک مجاوروں کو نہ دی جائے لیکن تمام رسومات مجاوروں کے ہاتھ سے ہی انجام پانی چاہئیں۔

محکمہ اوقاف کے اعداد و شمار کے مطابق ۷۴-۱۹۷۳ء میں مزار سے ۳۸ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی۔ اس سالانہ آمدنی سے مزار کی توسیع کے اخراجات کے علاوہ ایک فری ہسپتال چلایا جاتا ہے۔ ایک دارالمطالعہ قائم کیا گیا ہے اور مزار پر پیش کئے جانے والے کپڑوں اور زیورات سے یتیم بچیوں کو جہیز دیا جاتا ہے۔



باب ۳

ورد مسعود

یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو کیا ہے کہ داتا صاحب کو اپنے یا فوراً بعد کے زمانہ میں کوئی تذکرہ نویس نہ ملا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی عقیدت مند اہل قلم نے داتا صاحب کے سوانح حیات قلمبند کئے ہوں اور وہ غزنوی عہد کی بہت سی تصنیفات کی طرح زمانے کے الٹ پھیر کی نذر ہو گئے ہوں۔ اس وجہ سے داتا صاحب کے سوانح نگاروں کو ہر حصہ پر ظن اور قیاس کا سہارا لینا پڑتا ہے اور یوں ہم کسی واضح نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے۔

لاہور میں ورود

داتا صاحب کے لاہور میں ورود کا زمانہ متعین کرنے میں بھی مشکل درپیش ہے۔ "نقحات الانس" اور "سفینۃ الاولیاء" میں داتا صاحب کے لاہور شریف لانے کی کوئی تاریخ نہیں بتائی گئی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد (۱۷۰۱ء تا ۱۷۰۷ء عیسوی) کے ایک مؤرخ سبجان رائے بٹالوی نے اغلباً پہلی بار داتا صاحب کے ورود لاہور کا زمانہ ہمیں بتایا ہے۔ وہ صوبہ دار السلطنت لاہور کے ذیل میں لکھتا ہے:

"لاہور میں سرتاج اولیائے عظام حضرت میر علی ہجویری"

کی خواب گاہ ہے جو دلی ہونے کے علاوہ علم و فضل

میں بھی کامل تھے۔ وہ محمود غزنوی کے ہمراہ غزنم ہے

لاہور آئے اور یہیں فوت ہوئے۔ سلطان کا عقیدہ تھا

کہ لاہور کی فتح انہیں کی توجہ سے ہوئی۔^۲

ہم گذشتہ باب میں داتا صاحب کی ولادت کے زمانہ پر روشنی ڈال چکے ہیں جو

چوتھی صدی کے آخری یا پانچویں صدی ہجری کے ابتدائی ایام تھے۔ مولوی محمد شفیع مرحوم
نے لکھا ہے :

”یہ امر طے شدہ ہے کہ سلطان کے حملوں کا زمانہ ۵۳۹۲ھ/۶-۱۰۱۱ھ

اور ۵۴۱۵ھ/۲۲-۱۰۲۲ھ تک تھا۔ اگر داتا صاحب ۵۴۱۵ھ/۲۲-۱۰۲۲ھ

میں بھی لاہور آئے ہوں تو ان کی عمر پندرہ بیس سال کے قریب

ہوگی جو ان کا ناموں کے لئے موزوں عمر نہیں۔“^۲

اسی طرح ”رسالہ ابدالیہ“ مؤلفہ یعقوب بن عثمان الغزنوی کی یہ روایت بھی درست

نہیں لگتی کہ داتا صاحب نے محمود غزنوی کے دربار میں ایک ہندو فلسفی سے مناظرہ کیا

اور اپنی کرامات سے اسے درط حیرت میں ڈال دیا۔ محمود غزنوی داتا صاحب کے لڑکپن

یعنی ۵۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں انتقال کر چکا تھا۔

کشف المحجوب کا ایک نسخہ لاہور سے ۱۹۲۳ء میں مولانا احمد علی استاد اسلامیہ

کالج و خطیب شاہی مسجد کی تصحیح کے بعد شائع ہوا تھا۔ اس کے خاتمے پر کاتب صاحب نے

داتا صاحب کے سوانح حیات کا اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”پہلے آپ نے خراسان و نیزد کا سفر کیا۔ پھر پیر کے حکم سے

ہندوستان آئے۔ اس بارے میں دو روایتیں ہیں :

ایک تو یہ کہ سلطان مسعود بن محمود غازی کے ساتھ آئے

دوسری یہ کہ لاہور میں ورود سلطان مسعود کے آخری سال

۵۴۳۱ھ / ۱۰۳۹ء میں ہوا۔

تعجب ہے کہ سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم ایسے محقق نے کاتب صاحب کی بیان کردہ پہلی روایت کو قرین قیاس سمجھ کر قبول کر لیا۔ حالانکہ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ کاتب صاحب نے اپنے بیانات کا کوئی حوالہ نہیں دیا، اور اس کی بعض روایتیں صریح تاریخی واقعات کے خلاف پائی جاتی ہیں۔ مگر لکھتے ہیں :

”تاہم داتا صاحب کے سلطان کی فوج میں آنے کی بات دل

کو لگتی ہے۔ مسعود نے ۵۴۲۹ھ / ۱۰۳۷ء میں ہانسی پر حملہ

کیا تھا۔ بہت ممکن ہے اس لشکر کے ساتھ ہمارے مدد

مندان اور پھر پہلی مرتبہ لاہور آئے ہوں۔“

مولانا ہاشمی نے ایک بے سند روایت کو کیوں قبول کیا؟ اس کی انھوں نے

کوئی وجہ تو نہیں بتائی، لیکن اس کے حق میں دلائل تلاش کرنے میں بڑی محنت کی ہے

آقا جیبی نے ۵۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء کے بعد داتا صاحب کا لاہور میں قیام ظاہر

کرنے کے لئے نہایت عجیب دلائل کا سہارا لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ : داتا صاحب نے

کشف المحجوب میں شیخ المشائخ ابو سعید ابو بخیر کے نام کے ساتھ دلائل خیر کی ہے

جس سے پتہ چلتا ہے کہ کشف المحجوب کی تصنیف کے وقت رحلت فرما چکے تھے۔

ان کی رحلت ۵۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء میں ہوئی تھی اور چونکہ بجوری علیہ الرحمہ نے اپنی

کتاب کشف المحجوب لاہور میں لکھی ہے۔

”بنابریں ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ موصوف

۵۴۴۰ھ کے بعد لاہور میں رہ چکے ہیں۔“

آقا جیبی مزید لکھتے ہیں کہ کشف المحجوب کی تحریر کے وقت شیخ ابوالقاسم

گرگانی بقید حیات تھے اور ہجوری نے طوس میں ان سے ملاقات کی تھی۔ گرگانی رح موصوف نے ۵۴۵ھ/۵۸-۱۰۵۸ء میں اس دیرگانی سے کوچ کیا۔ لہذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہجوری ۵۴۵ھ/۵۸-۱۰۵۸ء کے بعد لاہور میں سکون تھے۔ اور کشف المحجوب کی تصنیف میں مشغول تھے۔

ان دونوں واقعات سے داتا صاحب کے لاہور میں مقیم ہونے کا حکم لگانا اسی بات ہے کہ حقائق اس کی تصدیق نہیں کرتے۔

داتا صاحب کا اپنا بیان

داتا صاحب کرامت اولیاء کے ضمن میں ایک ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ ایک مرتبہ میہنہ میں شیخ ابوسعیدؒ کی تربت پر اپنی عادت کے مطابق تنہا بیٹھ تھے کہ ایک سفید کبوتر اڑتا ہوا آیا اور مزا کے غلاف میں گھس گیا۔ داتا صاحب نے ... غلاف اٹھا کر دیکھا تو کبوتر غائب تھا۔ اس سے لگے روز بھی یہی واقعہ پیش آیا تو داتا صاحب حیران ہوئے۔ آخر ایک رات خواب میں شیخ ابوسعیدؒ نے انکشاف کیا کہ وہ کبوتر ان کے معاملہ کی صفائی بنے جو روزانہ ہم نشینی کے لئے آتا ہے۔ شیخ ابوسعید کا انتقال، ۵۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء میں ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ کبوتر والا واقعہ ۵۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء کے بعد کا ہے اور اس زمانہ میں داتا صاحب میہنہ میں مقیم تھے جو غراسان کا ایک گاؤں ہے۔ نیز گدڑی پہننے کی شرائط میں لکھا ہے :

”میں نے کہ علی بن عثمان الحبلا بی ہوں، طوس میں شیخ

ابوالقاسم گرگانیؒ سے استفادہ کیا کہ درویش کو فقر

کا سزاوار بننے کے لئے کیا لازم ہے....“

شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ کا انتقال ۵۴۵۰ھ/۵۸-۱۰۵۸ء میں ہوا تھا۔ ان دونوں واقعات

سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ۵۴۴۰/۱۰۴۸ اور ۵۴۵۰/۱۰۵۸ کے درمیان عرصہ میں
داتا صاحب خراساں میں تعلیم کے مراحل طے کر رہے تھے۔ اس کے بعد ایک اور
واقعہ لکھتے ہیں کہ :

” ایک دفعہ میں اپنے شیخ کے ساتھ آذربائیجان میں جا رہا تھا
کہ دو تین گدڑی پوشوں کو دیکھا، وہ گیسوں کے ڈھیر پر، دامن
پھیلائے کھڑے تھے۔ شیخ نے ان کی طرف دیکھ کر یہ آیت
پڑھی (ترجمہ) یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی
خریدی۔ پس ان کی تجارت کچھ نفع مند نہ ہوئی اور دراصل وہ ہدایت
پانے والے نہ تھے۔“

اپنے مرشد کے سوانحی خاکے میں داتا صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ اپنے شیخ حضرت
ابوالفضل محمد حسن مختلی کی رحلت کے وقت ان کے سر پرانے موجود تھے اور انھوں
نے اپنا سر داتا صاحب کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ شیخ کی وفات بیت الحنن میں ہوئی۔
جو داتا صاحب کے بقول بانیان اور مشرق کے درمیان واقع ہے۔ حضرت المختلی کا
سال وفات ۵۴۶۰/۶۸-۶۹ ہے۔

پس سے ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ۵۴۴۰/۱۰۴۸ اور ۵۴۵۰/۱۰۵۸
کے درمیان داتا صاحب خراساں میں تھے اور ۵۴۵۰/۱۰۵۸ اور ۵۴۶۰/۶۸-۶۹
کے درمیان آذربائیجان اور شام کی سیاحت فرما رہے تھے لہذا زیادہ قرین قیاس یہی
ہے کہ آپ ۵۴۶۰/۶۸-۶۹ میں اپنے مرشد کی وفات کے بعد ہی لاہور میں
تشریف لائے ہوں گے۔

لاہور میں دوبار آئے :

مولوی محمد شفیع مرحوم کی رائے بھی یہی ہے کہ داتا صاحب ۵۴۶۰ کے بعد

لاہور آئے ہوں گے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر داتا صاحب کے محمودی شکر کے
ساتھ لاہور آنے کے متعلق "خلاصۃ التواریخ" کی روایت درست ہے تو پھر
یہ ماننا پڑے گا کہ داتا صاحب ایک سے زیادہ دفعہ یہاں تشریف لائے۔ غالباً
یہی بات مولانا ہاشمی مرحوم کے ذہن میں تھی کہ سلطان مسعود کے ساتھ لاہور آنے کے بارے
میں ایک کاتب کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ داتا صاحب دو مرتبہ لاہور آئے
ہوں گے، ان کے الفاظ ہیں :

"داتا صاحب غالباً سلطان مسعود اول کی ہاشمی پر شکر کشی میں
ملتان اور پہلی مرتبہ لاہور آئے۔ مگر مستقل سکونت بہت
عرصے کے بعد اختیار کرنے کی نوبت آئی ہوگی۔ کیونکہ سالہا
سال تک وسط ایشیا کے مختلف ممالک میں سیاحت کرتے
رہے۔"

کسی مٹھوس شہادت یا واضح اشارہ کی عدم موجودگی میں داتا صاحب کے دو مرتبہ لاہور آنے
کی روایت قابل قبول نہیں۔ ترجیح اسی رائے کو حاصل ہے کہ داتا صاحب ۴۶۰ھ /
۱۰۶۷ء کے بعد لاہور تشریف لائے تھے۔

سلطان المشاخ کی روایت

داتا صاحب کے لاہور میں ورود کے بارے میں سب سے پرانی اور مقبول روایت
وہ ہے جسے سلطان المشاخ نظام الدین اولیاء نے بیان فرمایا تھا۔ یہ روایت —
"فوائد القواد" میں ۲۹ ذی قعدہ ۷۸۰ھ بمطابق ۱۰۸۷ء کی ایک مجلس میں یوں
آئی ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء نے فرمایا :

"شیخ علی ہجویری اور شیخ حسین زنجانی ایک ہی مرشد سے بیعت
کئے۔ شیخ حسین مدت سے لاہور میں فریاد کرتے۔ ایک روز

مرشد نے شیخ علیؒ کو لاہور جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہاں
تو زنجانیؒ موجود ہیں۔ پھر ارشاد ہوا کہ تم جاؤ۔ چنانچہ وہ روانہ ہو
گئے۔ رات کے وقت لاہور پہنچے۔ اسی رات حسین زنجانیؒ
کا انتقال ہوا، اور صبح ان کا جنازہ اٹھایا گیا۔

"فوائد الفواد" حضرت نظام الدین اولیاء (وفات ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء) کے موقوفات
کا مجموعہ ہے جسے ان کے ایک محبوب خلیفہ میر حسن علامہ سجویؒ نے مرتب کیا۔ اس مجموعہ
کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امیر خسروؒ رشک کے ساتھ فرمایا کرتے تھے
"کاش میری تمام تصنیفات حسنؒ کے نام سے ہوتیں اور یہ ایک میرے نام سے"۔
سلطان (مشارحؒ) نے یہ روایت کس سے سنی ہے اس کے بارے میں کوئی تصریح نہیں
ملتی۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کو لاہور سے بھی نسبت تھی۔ وہ یوں کہ آپ کے دادا خواجہ
علی بخاریؒ اور نانا خواجہ عرب صاحبؒ جب بخارا سے وادِ ہند ہوئے تو لاہور میں کچھ عرصہ
قیام کرنے کے بعد بدایوں گئے تھے۔ ان کا زمانہ داتا صاحبؒ سے نزدیک ٹھہرتا ہے۔
غالب گمان ہے کہ انھوں نے بزرگانِ لاہور سے جو باتیں سنی تھیں، اپنے بیٹوں۔ پوتوں
نواسوں کو سنائی ہوں گی۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے لاہور کے متعلق اور روایتیں بھی بیان
کی تھیں۔ خواجہ صاحب کے یہ ارشادات اخیر عمر کے ہیں۔

"فوائد الفواد" شروع اس وقت ہوئی جب شیخ کی عمر ستر برس سے
متجاوز ہو چکی تھی اور بند اس وقت ہوئی جب شیخ کی وفات کو
کل دو ڈھائی سال رہ گئے تھے۔

مولانا ہاشمی مرحوم نے اس شبہ کا اظہار کیا ہے کہ داتا صاحب کے شیخ زنجانیؒ کے
انتقال کے دن لاہور آنے کی روایت بعد کا اضافہ ہے۔ لکھتے ہیں
"واضح رہے کہ فوائد الفواد قبولِ عام کی وجہ سے قرونِ گزشتہ

میں کثرت سے نقل ہوتی رہی ہے اور اس لئے بھی الحاقات
 سے محفوظ نہیں سمجھی جاسکتی۔ اگرچہ اسکی یہ عبارت شروع
 گیارھویں صدی میں "ثمرات القدس" کے تالیف ہونے کے
 وقت موجود تھی اور ثمرات میں نقل کی گئی ہے۔ اس کے
 سوا کسی دوسرے قدیم تذکرے میں نہیں آئی^{۱۸}۔

نیز یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ داتا صاحب اپنے مرشد کی رحلت کے وقت انکے سر ہاتے
 موجود تھے۔ ان کے آخری الفاظ مسئلہ اعتقاد کے بارے میں تھے جنہیں داتا صاحب نے
 کشف المحجوب میں محفوظ کر دیا ہے اور یہ صراحت کی ہے کہ مرشد نے اس سے زیادہ کوئی وصیت
 نہ کی۔^{۱۹} ان آخری الفاظ میں لاہور جانے کا کوئی ذکر نہیں۔ مولانا ہاشمی نے ہماری توجہ اس طرف
 مبذول کرائی ہے کہ "کشف المحجوب" میں بیسیوں معاصرین کا ذکر ہے۔ شیخ حسین زنجانی
 کا نام کہیں نہیں لکھا۔ البتہ اذربائیجان کے ایک بزرگ شیخ شفیق فرخ معروف بہ انخس
 زنجانی "کا محبت و عقیدت سے ذکر کرتے ہیں۔ نفحات الانس میں ان کی وفات ۵۵۴ھ /
 ۱۰۶۵ء بتائی گئی ہے۔ شیخ حسین زنجانی "چھٹی صدی ہجری کے اواخر یعنی داتا صاحب سے
 کوئی ڈیڑھ سو برس بعد کے بزرگ ہیں۔"

حضرت داتا صاحب اور شیخ حسین زنجانی کی معاشرت کے خلاف کئی شواہد موجود
 ہیں۔ "آئین کبیری" میں شیخ زنجانی اور خواجہ معین الدین چشتی "کی لاہور میں ملاقات کا ذکر
 کیا گیا ہے اور سال وفات ۵۰۰ھ / ۱۰۲۳ء یا کچھ بعد لکھا ہے۔^{۲۱} داراشکوہ نے بھی "سفینۃ
 الاولیاء" میں حضرت معین الدین چشتی کے حالات میں اس امر کی تصدیق کی ہے کہ جب
 خواجہ غمبیر لاہور شریف لائے تو شیخ حسین زنجانی "سے ملاقاتیں کیں۔" خزینۃ الاسفیا کے
 مطابق خواجہ اجمیر کی لاہور میں سید یعقوب زنجانی رح المعروف بہ صدر دیوان میں بڑی محبت
 الفت ہو گئی۔ سید یعقوب کے مزار سے متصل خواجہ اجمیر کی نشست گاہ باقی ہے۔^{۲۳}

”تحقیقات حشری“ میں بھی یہی روایت درج ہے اور وضاحت کی گئی ہے کہ سید یعقوب زنجانی اپنے تین سامعینوں یعنی شیخ المصباح حسین زنجانی، سید اسحاق زنجانی اور شیخ علی لاحق (مدفون سیالکوٹ) کے ہمراہ ۱۲۵۵ھ/۱۱۶۲ء میں لاہور آئے اور بعد ازاں جب خواجہ اجیر تشریف لائے تو ان بزرگوں سے باہم محبتیں رہیں۔

اگرچہ شیخ حسین زنجانی کے سال وفات کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے مگر مذکورہ واقعات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جناب حسین زنجانی لاہور میں داتا صاحب کے پیش رو نہ تھے بلکہ سید یعقوب زنجانی (المتوفی ۸۰۴ھ/۱۲۰۶ء) اور خواجہ معین الدین حشری (وفات ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء) کے معاصر تھے۔ آقائے حبیبی نے اپنے مقالہ ”تاریخ وفات داتا گنج بخش“ میں اس موقف سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے :

”خزینۃ الاصفیا“ میں حسین زنجانی کی رحلت کا سال ۶۰۰ھ/۱۲۰۳ء قرار دیا گیا ہے جو اس وجہ سے غلط ہے کہ فوائد الفواد کی روایت کے خلاف ہے۔“

آئین اکبری - سفینۃ الاولیاء - خزینۃ الاولیاء اور مولوی شفیع (مقالات علمی حیدر اول علیہ السلام) کی شہادتوں کے مقابلے میں حبیبی کا جذباتی اور بے سند قول ”چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔“

ناگوار قیام

داتا صاحبؒ کے اپنے مرشد کے حکم پر لاہور آنے کے حق میں ”کشف المحجوب“ کی عبارت پیش کی جاتی ہے : کہ

”میں نے اوقت اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں کیونکہ میری کتابیں عزیزین اللہ اسکی حفاظت کرے، میں رہ گئی ہیں اور میں یہاں

۲۶
دیارِ ہند میں ناہنسوں کے درمیان پھنسا ہوں“

نگسن نے (دیباچہ ۵) درمیان ناہنساں گرفتار شدہ کا مفہوم یہ لیا ہے۔ کہ
داتا صاحب ”گرفتار“ کر کے لاہور لائے گئے تھے۔ غالباً نگسن کے اتباع میں یہ خیال
ظاہر کیا گیا ہے کہ چونکہ داتا صاحب نے لاہور کا ذکر ناگواری کے ساتھ کیا ہے لہذا ضرور
اپنی مرضی کے خلاف اور مرشد کے حکم کی مجبوری کے باعث تشریف لائے ہوں گے۔
اگر یہ بات درست ہوتی کہ داتا صاحب اپنے مرشد کے حکم پر لاہور آئے تھے تو بھی ان جیسے
ولی اللہ سے یہ امید نہ کرنی چاہیے کہ اپنے مرشد کے حکم پر ناک بھوں چڑھاتے۔

داتا صاحب کے پیشرو

غالباً خلاصۃ التواریخ کے اتباع میں بعض سوانح نگاروں نے کہا ہے کہ داتا صاحب
پہلے مبلغ تھے جو سرزمین لاہور میں وارد ہوئے۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ ثابت ہو چکا
ہے کہ شیخ حسین زنجانی داتا صاحب سے پہلے کے نہیں بعد کے بزرگ ہیں۔ سوال
ہے کہ داتا صاحب سے پہلے کون کون سے بزرگ ارض لاہور میں تبلیغ دین کا فریضہ
انجام دے چکے تھے؟ اس سوال کے جواب میں اپنی بے مائیگی کا اقرار کرتے بغیر نہیں بتی۔
ہماری محدود اطلاعات کے مطابق لاہور میں جس اولین عالم کی موجودگی ثابت ہوتی ہے وہ
”ابو الفتح عبد الحمید بن عبد الرحمن اشعشی لوہوری (لاہوری) ہیں جنہوں نے سمرقند میں علم حاصل
کیا اور ۳۲۹ھ / ۱۰۳۷ء میں لاہور میں وفات پائی۔ آپ کا تذکرہ سمعانی نے کتاب
الانساب میں کیا ہے۔“

مولانا ریاست علی ندوی نے عین اسی زمانے کے ایک اور بزرگ کی اطلاع دی

ہے۔

”شیخ ابو المنصور بن علی غزنوی کو جو مدت اہل علم میں سے تھے۔“

سلطان مسعود غزنوی نے ۵۲۶ھ / ۱۰۳۴-۳۵ء میں
ہندوستان بھیجا، لاہور میں قیام تھا۔ انہیں دیوان لائشا
کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

ہم ان دونوں بزرگوں سے زیادہ شیخ اسماعیل بخاریؒ سے واقف ہیں۔ اگرچہ
آپ ان دونوں بزرگوں سے پہلے ۵۳۹ھ / ۱۰۴۷ء میں لاہور آئے تھے مگر وفات
ابو الفتح کے انیس سال بعد ۵۴۸ھ / ۱۰۵۶ء میں ہوئی۔ "تذکرہ علمائے ہند" کے
مطابق شیخ اسماعیلؒ پہلے بزرگ تھے جن کی بدولت تفسیر و حدیث کا علم لاہور میں پہنچا۔
"خزینۃ الاصفیاء" اور "تحقیقات حشری" میں ان کے شاندار تبلیغی کارناموں کا ذکر ملتا
ہے۔ مولوی نور احمد حشری نے ہال روڈ لاہور پر ان کے مزار کی نشان دہی کی ہے۔
مولانا ہاشمی کا یہ خیال توجہ چاہتا ہے کہ :

"ایک روایت کے مطابق داتا صاحب محمود سے قبل لاہور آئے
اور انہی کی تحریک سے سلطان نے اس شہر کو تسخیر کیا۔ ممکن
ہے کہ اصل میں اس روایت کا تعلق ان بزرگ (شیخ اسماعیل)
سے ہو اور عین ممکن ہے کہ یہ وہی بزرگ ہوں جن کا ذکر داتا
صاحب نے تذکرہ معاصرین غزنوی میں ان الفاظ میں کیا
ہے۔ " شیخ مجروح خلائق مفرد اسماعیل الشاشی پیرے
محترم بود و بر طریق ملامت رفتے "۔ بخاری اور شاشی ہونے
میں کچھ تناقض نہیں ہے۔ اسی طرح داتا صاحب کی مثل ان کا
غزنوی ہونا اور آخر میں لاہور آجانا کچھ متباہد نہیں رکھتا۔"

داتا صاحب کے زمانہ میں لاہور میں دیگر علماء کی موجودگی اور لاہور میں مسجدوں کی
کثرت کا ثبوت داراشکوہ کی اس روایت سے بھی ملتا ہے کہ جب داتا صاحب نے ایک

مسجد تعمیر کرانی تو اس کا رخ قبلہ دوسری مسجد کی نسبت جنوب کی طرف جھکا ہوا تھا۔
 اس پر علمائے وقت نے اعتراض کیا۔ داتا صاحب نے معترضین کو اپنی مسجد میں جمع
 کیا۔ امامت فرمائی، تمام حجابات درمیان سے اٹھ گئے اور سامنے کعبہ نظر آنے لگا،
 اس سے صاف ظاہر ہے کہ داتا صاحب سے پہلے مسجد موجود تھیں تو علماء بھی ضرور
 ہونگے!



دانا صاحب کے عہد کا لاہور

کفرستان ہند میں پاکستان قائم کرنے کی مساعی کا آغاز خلافت راشدہ کے زمانہ میں ہوا تھا۔ ابوالعاص ثقفی کے فرزند حضرت عثمانؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ انہوں نے خلافت فاروقی کی ہست داری میں ۱۵ھ/۶۳۶ء یا اس کے بعد بحرین کی امارت ولایت پر فائز ہو نیکی بعد اپنے ایک بھائی حضرت حکم بن ابی العاصؓ کو کھتانہ (بسی) اور بھڑوچ پر شکرکشی کے لئے بھیجا، اور دوسرے بھائی حضرت مغیرہ بن ابی العاصؓ کو دیبل (کراچی) کی مہم پر بھیجا۔ جب یہ مہم جو فتیاب واپس آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو خفا ہوئے۔ حضرت عثمان بن ابی العاص کو لکھا:

”اے ثقفی! تو نے گویا کپڑے کو لکڑی پر سوار کر کے سمندر کے حوالے کر دیا ہے۔ خدا کی قسم اگر مسلمانوں پر کوئی آفت آئی تو میں تمہارے قبیلے سے اسکا بدلہ لوں گا“

یوں یہ سلسلہ جہاں کا تہاں رک گیا۔ اس کے دو سال بعد ۱۷ھ/۶۳۸ء میں حضرت عمرو بن ورقم نے سلطنت فارس سے فیصلہ کن ٹکڑے کے لئے امیر بصرہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو ہدایات جاری کر کے حضرت سہیل بن عدیؓ کی جنرل کمان میں سات فوجیں

ترتیب دی۔ ان کے ساتھ امیر مقرر کئے جنہوں نے بیک وقت مختلف علاقوں پر چڑھائی کر دی۔ مکران کے محاذ کی کمان حضرت حکم بن عمرو ثعلبہؓ کے سپرد تھی۔ انہوں نے ۲۱ یا ۲۳ھ / ۶۲-۶۱ یا ۶۴-۶۳ میں کارروائی شروع کی۔ سندھیوں نے مکرانیوں کی بھرپور مدد کی مگر شکست کھائی۔ اور میدان سے بھاگ گئے۔ مکران کی فتح کی خوش خبری مال غنیمت کے خمس کے ساتھ حضرت صحابہؓ کے ہاتھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پہنچائی۔ اس محاذ کی مشکلات سننے کے بعد فاروق اعظمؓ نے مکران سے اگے بڑھنے کی ممانعت کر دی۔ حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں ۶۶ھ / ۶۶۴ء میں مہلب بن ابی صفورہ نے موجودہ صوبہ سرحد پر چڑھائی کی اور پیش قدمی کرتے ہوئے بنہ (بٹوں) اور اراہوار و لاہور واقع صوبہ سرحد تک جا پہنچے۔ بہر حال یہ فتح عارضی ثابت ہوئی۔

پہلی صدی ہجری کے آخری چند سالوں میں محمد بن قاسم کے زیر قیادت اسلامی فتوحات اتنی مشہور ہیں کہ ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ محمد بن قاسم نے ۹۵-۹۴ھ / ۱۲-۱۱ء میں ملتان کو فتح کیا مگر سندھ کی نئی اسلامی مملکت میں توسیع کا سلسلہ یہیں رک گیا۔ یوں سرحد اور پنجاب اسلامی انقلاب سے نا آشنا رہے تا آنکہ محمود غزنوی نے گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں پنجاب اور سرحد کو اسلامی مملکت کے حدود میں شامل کر لیا۔

پنجاب کا سیاسی نقشہ

دانا صاحب سے پہلے یا ان کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں پنجاب اور سرحد کئی سیاسی اکائیوں میں منقسم تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں سب سے بڑی ریاست وہیندھ تھی جہاں پر جے پال حکمران تھا۔ اس ریاست کی سرحد جہلم یا چناب پر ختم ہو جاتی تھی۔

کوہستان نمک میں ایک اور چھوٹی ٹیسی ریاست تھی جس کا صدر مقام چکوال کے
 نزدیک نندونہ یا نندونہ تھا۔ جسے پال کے بیٹے اتند پال نے وہیہند میں محمودی شکر
 سے شکست کھانے کے بعد نندونہ کو اپنا مرکز بنایا۔ اس کے بیٹے تروچن پال سے
 محمود نے نندونہ کا قلعہ بھی چھین لیا۔

کوہستان نمک کے دوسری طرف بھیر کی ریاست تھی۔ جس کا حکمران نجی رائے تھا۔
 وہ بھی محمودی یلغار کے اگے نہ ٹھہر سکا۔ چناب اور بیاس کے درمیان ایک گنام سی مملکت تھی
 جسے البیرونی نے ریاست لہاور کا نام دیا ہے اور دریائے راوی کے کنارے واقع مندر کور
 کو اس کا صدر مقام بتایا ہے۔ بیاس کے پار جالندھر کی ریاست تھی جس کے حکمران کا نام رائے
 پورہ بتایا جاتا ہے۔ شمال میں کشمیر کی ریاست تھی جس پر سنگرام راج حکومت کرتا تھا۔ محمود
 نے دو کوششوں کی ناکامی کے بعد تسخیر کشمیر کا خیال دل سے نکال دیا۔

جنوب میں ملتان اور منصورہ کی اسلامی ریاستیں تھیں۔ ملتان میں آل سامہ کے محمد بن
 قاسم بن منہ نے ۵۲۹ھ اور ۵۲۸ھ/۸۹۲ء اور ۸۹۹ء کے درمیان اپنی حکومت قائم کی
 تھی جسے دانا صاحب سے ذرا ہی پہلے ۵۳۶ھ اور ۵۳۵ھ/۹۴۰ء اور ۹۸۵ء
 کے درمیان قرمطی داعی جلم بن شیبان نے ہتھیالیا تھا۔ بیرونی نے تصدیق کی ہے کہ
 وہ شیعی تھا اور اس نے بنو امیہ کے دور کی جامع مسجد بغض معاویہ میں بند کرا دی تھی۔
 محمود غزنوی کے وقت ملتان پر ابوالفتح داؤد بن نصیر بن حمید باطنی حکمران تھا۔ محمود نے اسے
 ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں شکست دے کر ملتان میں اہلسنت کی حکومت دوبارہ قائم کر دی۔ منصورہ
 رضلع سانگھڑ میں شہدادپور سے ۱۱ میل دور اس کے کھنڈر برآمد ہو گئے ہیں، میں بیماری
 خاندان کی حکومت تھی جو مقدسی کے بقول سُنی تھے مگر ۱۴-۱۵/۴۱۴-۲۶/۱۰۲۵ء میں محمود
 غزنوی نے سومات سے واپسی پر حاکم منصورہ کو مرتد قرار دیکر اس کی حکومت چھین لی۔
 یوں محمود غزنوی نے سرزمین ہند میں جو نئی مملکت قائم کی اس کا نقشہ پاکستان کے موجودہ

نقشہ کے عین مطابق تھا

پنجاب کا پرانا نام

محمود غزنوی نے پنجاب کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر

کے بالآخر ۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء میں اسے غزنی میں شامل کر کے ایک متحدہ صوبے کی حیثیت دے دی اور عبد اللہ قراتگین کو پہلا سالار یا صوبیدار مقرر کیا، اور موجودہ لاہور کو اس صوبے کا صدر مقام قرار دیا۔

عام خیال ہے کہ اس خطے کو پنجاب کا نام مسلمانوں نے دیا تھا۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کے نام کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ پہلی تا چوتھی صدی عیسوی کے درمیان کے ایک ہندو مصنف نے اس علاقہ کے لئے پانچ دریاؤں کی سرزمین کا نام استعمال کیا ہے۔ ابیرونی نے بھی اسے پانچ دریاؤں کی سرزمین لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ملتان کے نزدیک جہاں پانچوں دریا ملتے ہیں اسے مقامی زبان میں پنجنہ کہتے ہیں۔ یہی پنجنہ فارسی میں پنجاب بن گیا۔

لاہور تھا کہ نہیں تھا

اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لاہور کیسا شہر تھا جس میں داماد صاحب نے علامہ اقبالؒ کے بقول اپنے جمال سے عہد فاروقِ رضا کو زندہ کر دیا تھا۔ اس شہر میں کیسے لوگ بستے تھے، جن کی اصلاح و تہذیب کے لئے داماد صاحب ساری دنیا چھوڑ کر یہاں آن بستے تھے۔ ان لوگوں کے شب و روز کیسے گزرتے تھے جن میں بیٹھ کر داماد صاحب نے کشف المحجوب جیسی کتاب لکھی۔

ان سوالوں کا واضح جواب معلوم کرنا محال ہے۔ ایسا تاریخی مواد جس سے اس زمانے کی حقیقی تصویر کھینچی جاسکتی تھی ضائع ہو چکا ہے یا ابھی تک ہماری نگاہوں سے

اوجھل ہے۔ یہاں تک کہ داتا صاحب کے زمانے سے پہلے لاہور کا وجود اور عدم وجود مابہ
النزاع ہے!

رام چندر کے بیٹے سے نسبت!

عام روایت ہے کہ لاہور کو راجہ رانچندر کے بیٹے لوہے نے آباد کیا تھا۔ سبجان رائے
بٹالوی نے اسے قبول کر کے تاریخی سند عطا کر دی^{۱۸}۔ کرنل ٹاڈ ۱۸۲۹ء نے کہا کہ لاہور
کی بنیاد رام کے بیٹے لوہے نے رکھی تھی اور پرانے زمانے میں لاہور کو لوہ کوٹ کہتے تھے
میواڑ کے راجے اسی لوہ کوٹ کے راجاؤں کی اولاد ہیں جو ۱۲۵۰ء میں منقل مکانی
کر کے دوار کا آئے تھے۔^{۱۹}

جسٹس ٹی ایچ تھارنٹن نے لاہور کا سراغ مشہور یونانی جغرافیہ دان بطلمیوس
(دواح ۱۶۱ء) سے لگا یا کہ اس نے لکھا تھا:

”باختر سے پاٹلی پتر کو جانے والے راستے پر لبو کلا نامی شہر
آباد ہے۔ یہ لبو کلا لاہور ہے۔ لبو، نو کی بگڑی ہوئی شکل
ہے۔“

اس طرح لاہور کو ویدک زمانے کا شہر قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لاہور کی
قدامت کے ضمن میں، مسلم مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں کے حوالے بھی پیش کئے
جاتے ہیں مثلاً بلاذری نے صوبہ سرحد پر مہلب بن ابی صفزہ کی مہم کا ذکر کرتے ہوئے
’الہوار‘ کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ملتان اور کابل کے درمیان واقع ہے۔^{۲۱}
”حدود العالم“ کے نامعلوم مؤلف نے لکھا ہے کہ لاہور بہت بڑا شہر ہے۔ ملتان کے
تحت ہے اور بازار اور مندر بہت ہیں جو زبندی۔ بادام اور چیلغوزہ کے درختوں کی
بہتات ہے اور یاقوت الرومی نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے شہروں میں لاہور بہت
بڑا شہر ہے۔^{۲۲}

سرحد کے لاہور سے التباس

اس کے برعکس دسویں صدی عیسوی سے پہلے لاہور کے وجود سے انکار کرنے والوں کا کہنا ہے کہ سٹرابون نے ۶۰ ق م اور ۱۹ء کے درمیان لکھتے ہوئے لاہور کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ پلینی نے ۲۳ء اور ۷۹ء میں سندھ اور الہ آباد کے مابین منازل کا حال لکھا ہے مگر ان میں لاہور کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ سکند نے موجودہ لاہور کے کہیں قریب سے ہی دریائے راوی کو عبور کیا تھا مگر اس کے مؤرخین نے بھی لاہور کا ذکر نہیں کیا۔ چینی سیاح ہوئن چوانگ نے ۶۳ء میں پنجاب کی تفصیلی سیاحت کی تھی۔ اس نے پنجاب کے کئی شہروں کا حال لکھا ہے۔ مگر لاہور کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بطلمیوس نے باختر سے پاٹلی پتر (پٹنہ) جانے والی شاہراہ پر واقع جس شہر لبوکلا کا ذکر کیا ہے۔ اس کا محل وقوع کیسپیر یا (کشمیر) کے علاقہ میں قرار دیا ہے لہذا لبوکلا کا اطلاق موجودہ لاہور پر نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر مسلم مؤرخوں اور جغرافیہ نویسوں کے بیانات کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ البلاذری کا الہوار موجودہ لاہور نہیں کیونکہ اس نے واضح کر دیا ہے کہ الہوار ملتان اور کابل کے درمیان ہے۔ اس زمانے میں کابل سے براستہ ڈیرہ غازی خان ملتان جاتے تھے۔ اس راستے میں وہ لاہور ضرور آتا ہے جو ضلع مردان میں ہند کے نزدیک واقع ہے۔ مہلب بن ابی صفرة کے حملہ کے سلسلہ میں الہوار کا ذکر بند (ہنوں) کے ساتھ آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صوبہ سرحد والا لاہور ہی ہوگا۔ اسی طرح ”حدود العالم“ والے لاہور میں اخروٹ، بادام اور چلغوزہ کے درختوں اور مندروں کی بہتات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پنجاب کے لاہور کا نہیں سرحد کے لاہور کا ذکر ہے۔ البیرونی نے دریائے سندھ کے منبع اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں کے ذکر میں

لہاؤر کا محل وقوع صوبہ سرحد میں متعین کر دیا ہے۔^{۲۳}

لاہور: ایک ریاست

البیرونی نے کتاب الہند میں مختلف راستوں اور منازل کا ذکر کیا ہے وہ قنوج سے غزنہ کے راستے میں مختلف پڑاؤ اور ان کے درمیانی فاصلے لکھتا ہوا تمام تک آتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہاں رستم، سے شمال مغرب کی طرف چلیں تو آتا ہوں پہنچتے ہیں جو نوز فرسخ ہے۔ وہاں سے ججائیر چھ فرسخ بنے اور وہاں سے مندھکوراٹھ فرسخ ہے جو دریائے راوی کے مشرقی کنارے پر ہے اور لہاؤر کا دار الحکومت ہے۔ وہاں سے دریائے چناب بارہ فرسخ۔ جہلم آٹھ فرسخ گندھارا کا صدر مقام ویہند جو سندھ کے مغربی کنارے پر ہے۔ بیس فرسخ اور وہاں سے پشاور چودہ فرسخ ہے۔^{۲۵}

یوں ہمیں پہلی بار پنجاب میں واقع لاہور کا ذکر ملتا ہے لیکن ایک شہر کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک ریاست کے طور پر۔ بیرونی نے اس کے صدر مقام کا نام مندھکور بتایا ہے اور سیپتی نے مندھکور۔ مولانا ہاشمی نے ان ناموں کو منڈی کھوکھ کی عربی شکل قرار دیا ہے۔ کتاب الہند کے مترجم زخاڈ نے لکھا ہے کہ بیرونی نے "قانون مسعودی" میں مندھکور کو ایک قلعہ بتایا ہے۔ (صفحہ ۴۷۰)

مندھکور سے محمود پور

مندھکور موجودہ لاہور کے آس پاس واقع تھا۔ مختار مٹن نے سیالکوٹ کے نزدیک مان کوٹ کو مندھکور بتایا ہے لیکن خان ولی اللہ خاں نے واضح کیا ہے کہ سیالکوٹ کے نزدیک مان کوٹ نام کا کوئی مقام ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ البیرونی نے۔ مندھکور کا عرض بلد خود معلوم کیا جو ۵۰۔ ۳۱ سے اور یہ موجودہ لاہور کے عرض بلد کے مطابق

ہے اور دونوں میں صرف سولہ منٹ کا فرق ہے لہذا مندھکور کے آثار یہیں کہیں ہونے چاہئیں۔ خان ولی اللہ خاں کا خیال ہے کہ شاید البیرونی کا مندھکور قدیم متڈاوالہ (مندریاں والہ) جو جو موجودہ لاہور سے بارہ میل جنوب مغرب میں راوی کے غری کٹارے پر واقع ہے اور قدیم روایات وہاں ایک معدوم قلعے کا سراغ دیتی ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ پنجاب کے دریاؤں کی گزرگاہیں مشرق سے مغرب کی طرف بہتی رہی ہیں لہذا مندھکور کو راوی کے مغربی کنارے پر نہیں بلکہ مشرقی کنارے پر تلاش کرنا چاہیئے۔

غزنویوں نے مندھکور کے نام کو بدل کر محمود پور کر دیا۔ لاہور کے عجائب گھر میں محمود غزنوی کی رحلت سے دو سال پہلے ۴۱۹ھ / ۱۰۲۸ء میں لاہور کے ٹکسال میں مضروب درہم موجود ہے جس پر محمود پور کا نام صاف لکھا ہے لیکن یہ نیا نام بھی زبانِ دِ عام نہ ہو سکا اور محمود کے پوتے مودود المتوفی ۴۲۹ھ کے دور میں متروک ہو گیا۔ اور سکوں پر لاہور مضروب ہونے لگا۔ داتا صاحب کے درود لاہور کے زمانے میں حکمران ابوالفضل ابراہیم بن مسعود کے عہد میں لاہور لکھا جانے لگا جو موجودہ مقامی تلفظ کے عین مطابق ہے۔

لاہور : دسویں عیسوی کا شہر

البیرونی نے لاہور نام کی ریاست کا ذکر کیا ہے۔ شہروں کے ناموں پر ریاستوں کے نام رکھے جانے کی روایت موجود ہے جیسے ریاست طتان اور سلطنت منصورہ وغیرہ اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ ریاست لاہور اسی نام کے کسی گتنام شہر سے موسوم ہوگی۔ اور یہی نام زبانِ زد عام ہو گا۔ جس نے سلطان مودود کو مندھکور اور محمود پور کے بجائے یہی مقبول نام لاہور اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

مولوی شفیع مرحوم نے اس کی تاریخی سند بھی تلاش کر لی ہے، یہ فخر مدبر کی کتاب "آداب الحرب و الشجاعت" ہے جو ۵۶۰ھ / ۱۱۱۰ء میں سلطان شمس الدین ایشتمش کی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد لکھی گئی۔ فخر مدبر نے بتایا ہے کہ شہر لاہور کی بنیاد والے لاہور جہندرنے رکھی۔ اسکا جانشین بیٹا ہرت لاہور پر پچھتر سال تک حکومت کرنے کے بعد ترانہ سال کی عمر میں مرا۔ اس راجہ نے نئے شہر لاہور میں سورج دیوتا کا بڑا مندر اور ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ یہ مندر وہاں تھا جہاں اب آداب الحرب کی تالیف کے وقت، مسجد حبشی واقع ہے اور قلعہ کی جگہ پر عرب جمعیت کی چھاؤنی بن گئی ہے۔ ہرت کے بیٹے جہندرت کی دیہند کے راجہ جے پال سے لڑائی چھڑ گئی۔ جے پال نے دوسری لڑائی میں جو ۳۸۹ھ / ۹۹۹ء میں ہوئی لاہور پر قبضہ کر لیا۔ جہندرت قید کر لیا گیا مگر اس کے اہل خانہ بھاگ کر جالندھر کے راجہ رائے پورہ کے ہاں پناہ گزین ہوئے۔ اشد پال نے لاہور کو دیہند کے ماتحت صوبہ بن کر اپنے ولی عہد اشد پال کو اس کا والی مقرر کیا۔

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ موجودہ لاہور کی تعمیر دسویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی اسی لئے پرانی تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

لاہور کشف المحجوب میں

لاہور کے ضمن میں داتا صاحب کی ایک عبارت غور طلب ہے۔ کشف المحجوب کے قدیم لاہوری ایڈیشن میں اور نکلسن کے زیر نظر، مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں داتا صاحب کی وہ عبارت جس میں اپنی کتا میں غزنی میں رہ جانے پر افسوس کیا گیا ہے۔ یوں مرقوم ہے :

”فے الحال اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں کیونکہ میری کتابیں

غزنی (خدا اُسے محفوظ رکھے) میں رہ گئی ہیں اور میں یہاں

دیار ہند میں شہر لاہور میں کہ ملتان کے مضافات میں ہے

ناجنسوں کی محبت میں گرفتار ہوں^{۳۲}“

کشف کے روسی ایڈیشن کے متن میں :

”در بلدہ لاہور کہ از مضافات ملتان ہست“

کے الفاظ شامل نہیں ہیں بلکہ حاشیہ میں دوسرے نسخوں کے حوالے سے درج کئے

گئے ہیں۔ مولوی شفیع مرحوم کے نسخے میں بھی جسے شیخ بہار الدین ذکر یا نے نقل کیا ہے

یہ الفاظ متن میں موجود نہیں ہیں۔ بلکہ حاشیہ میں ان کا اضافہ کیا گیا ہے^{۳۳}۔ ہمارے لئے یہ

اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہ حاشیہ شیخ بہار الدین کا لکھا ہوا ہے یا بعد کا اضافہ ہے۔

مولانا علم الدین سالک مرحوم اسے سرے سے لاہور ہی نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ یہ

لفظ لاہور ہے اور لاہور نامی ایک قصبہ مضافات ملتان میں ہے شک موجود تھا^{۳۴}۔

اس بحث سے قطع نظر حیرت اس بات پر ہے کہ کیا واقعی داتا صاحب کے زمانے میں

لاہور اتنا ہی گمنام تھا کہ اس کا پتہ بتانے کے لئے ملتان کا حوالہ دینا ضروری خیال

کیا گیا؟۔ تاریخی حقائق اس بات کی تائید نہیں کرتے، حتیٰ کہ اگر داتا صاحب

۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں بھی تشریف لائے ہوں تب بھی یہ خیال درست ثابت نہیں ہوتا

لاہور کا غزنی سے تعلق

لاہور کی سیاسی، انتظامی اور تہذیبی اہمیت پر بحث سے پہلے ایک نظر غزنی

کی سیاست پر ڈال لینی چاہیے تاکہ اُسندہ مباحث کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ داتا

صاحب کے زمانہ حیات میں غزنی کے تحت پرگیارہ بادشاہ بیٹھے جن میں سے صرف

چھ کو صحیح معنوں میں بادشاہ کہا جاسکتا ہے۔ باقی پانچ ایسے ہیں کہ انہیں ایک سال سے

زیادہ عرصہ تک تخت پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ انہی محلاتی سازشوں کا نتیجہ تھا کہ
داتا صاحب کی پیدائش کے زمانہ میں جو خود مختار سلطنت غزنی میں قائم ہوئی تھی، وہ
ان کی رحلت کے وقت تخت نشین بادشاہ کے ساتھ ہی زوال کا شکار ہو گئی۔

لاہور: غزنویوں کی پناہ گاہ!

سلطان محمود غزنوی نے تینتیس برس حکومت کرنے کے بعد ۲۳ ربیع الثانی
۴۲۱ھ / ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء کو انتقال کیا تو ہمدان سے لے کر تھانیر تک وسیع سلطنت
اور اربوں روپے کا خزانہ جانشینوں کے لئے چھوڑ گیا، لیکن ساتھ ہی سراسر جذبہ باقی
وجود کی بنا پر ایسی خرابی کی بنیاد رکھ گیا جو گھن کی طرح اس کی سلطنت کو چاٹنے لگی۔
اس کے دو بیٹے محمد اور مسعود ایک ہی دن دو مختلف ماڈوں سے پیدا ہوئے تھے۔ محمد
بزم کا دھنی تھا تو مسعود رزم کا۔ مسعود کا گزر کسی پہلوان سے بھی نہ اٹھایا جاتا، اور
اس کا تیر فولادی چادر کے بھی پار نکل جاتا۔ اس نے نوٹری میں ہی تلوار کے وہ جوہر دکھائے
کہ محمود نے اسے اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔

زندگی کے آخری دور میں محمود مسعود سے بدظن ہو گیا اور اس کی ولی عہدی کو شسوخ کر
کے "خوش گفتار اور سعادت مند" محمد کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ نئے انتظام کی توثیق
خلیفہ سے کرائی اور اپنے امراء سے بھی۔ محمود کے آنکھیں بند کرتے ہی مرحوم کے محبوب
ایاز اور ابوسلی داہ جیسے امیروں نے محمد سے آنکھیں پھیر لیں اور مسعود سے جا ملے
رمضان / ستمبر میں خراسان کی فوج نے مسعود کی سلطانی کا اعلان کر دیا۔ محمد مقابلے کو نکلا
مگر اس کے امراء نے راہ میں ہی اسے معزول کر کے قید کر دیا اور مسعود کی اطاعت تسلیم
کر لی۔ پھر مسعود کے حکم سے محمد کو قید خانہ میں اندھا کر دیا گیا۔ یوں مسعود اسی سال تخت
غزنی پر متمکن ہو گیا۔

مسعود تلوار کا دھنی اور شجاعت کا پیکر ضرور تھا، مگر اس بصیرت سے محروم تھا جو صحیح حربی حکمت عملی اور منصوبہ بندی کے ذریعے فتح کی ضمانت بنتی ہے۔ الٹی سیدھی مہموں اور غلط منصوبہ بندی نے لشکریوں کا مورال گرا دیا۔ سیاسی اور انتظامی امور کو اس کے لائق وزیر خواجہ حسن میمنہ نے سنبھال رکھا تھا لیکن تین سال بعد میمنہ کی وفات سے وہ اس امداد سے محروم ہو گیا۔ اس وقت سلطنت غزنی کو دو خطرے لاحق تھے۔ مغرب میں سلجوقیوں کا اور مشرق میں ہندوستانی راجوں کا۔ وہ ان خطرات کے مقابلہ کے لئے ترجیحات کے تعین میں ناکام ہو گیا اور اس نے ساری توجہ اور طاقت ہندوستان پر مرکوز کر دی۔ یہاں اس نے ۱۰۲۹ھ/۱۰۳۸ء میں ہانسی فتح تو کر لی مگر جب غزنی واپس پہنچا تو سلجوق قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ اور انھوں نے رے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ مسعود نے مقابلے کی ٹھانی مگر پردہ پر ایسی شکستیں کھائیں کہ دو ہی سال بعد غزنی چھوڑ کر بچے کھچے شکر اور باپ کے جمع کردہ خزانوں کیساتھ پنجاب کو روانہ ہوا، تاکہ از سر نو فوجیں مرتب کر کے سلجوقوں کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن ابھی وہ راولپنڈی کے نزدیک مارگلہ کی پہاڑیوں میں پہنچا تھا کہ اس کے ترکی اور ہندو غلاموں نے بغاوت کر کے سارا خزانہ لوٹ لیا۔ مسعود کو اس سرائے میں قید کر دیا جس میں وہ کھڑا ہوا تھا۔ باغیوں نے اس کے اندھے بھائی محمد کو قید سے رہا کر کے سلطان بنا دیا اور پھر مسعود کو قید ہی میں مار دیا گیا۔

یہ خبر سنکر مسعود کا بیٹا مودود بلخ سے فوج لیکر ٹری برق رفتاری کیساتھ مارگلہ پہنچا۔ اس نے اپنے تایا (محمد، مسعود سے چند ثانیے بڑا تھا) محمد اور اسکے بیٹوں کو شکست دے کر قتل کر دیا اور سلطان بن بیٹھا۔

یہ سارے واقعات ۳۲۲ھ/۱۰۳۲ء کے ہیں۔ مودود نے اس خوشی میں اسی جگہ ایک شہر بسایا جسے فتح آباد کا نام دیا اور اپنے باپ کی میت لے کر غزنی واپس

گیا۔ یہی سنج آباد اچکل راولپنڈی کہلاتا ہے۔ ادھر مودود کے بھائی مجدد نے جو ملتان کا والی تھا محمود کے محبوب امیر ایز کی مدد سے لاہور پر قبضہ کر کے دریائے سندھ سے تھانیس تک کے علاقہ پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ مودود اس کی سرکوبی کے لئے لشکر لے کر نکلا اور ۶ ذی الحجہ ۴۳۳ھ / ۲۶ جولائی ۱۰۴۲ء کو لاہور پہنچ گیا ابھی صفیں آراستہ بھی نہ ہوتی تھیں کہ عین عید الاضحیٰ کے روز مجدد اپنے خیمے میں مردہ پایا گیا۔ اس کے چند روز بعد امیر ایز بھی انتقال کر گیا اور یوں ہندوستانی مقبوضات بھی مودود کے قبضہ میں آ گئے۔

اس سیاسی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ۴۳۵ھ / ۱۱۴۴ء میں ہندوؤں نے دہلی کے راجہ کی سرکردگی میں متحد ہو کر ہنسی، تھانیس اور کانگڑہ پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا۔ مگر لاہوری امرا اس سے نہ ہوتے اور باہم دست و گریبان رہے۔ بالآخر جب ہندوؤں کے متحدہ لشکر نے لاہور کا بھی محاصرہ شروع کر دیا، تو وہ خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور ہندوؤں کے مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آئے مگر ہندو لشکر مقابلہ کے بغیر پسپا ہو گیا اور یوں وہ علاقے جو ہندوؤں نے فتح کر لئے تھے ابھی کے قبضہ میں رہے اور مسلمان پیاس تک کے علاقہ پر قانع ہو کر بیٹھ رہے۔ ✓

غزنی میں اکھاڑ پھار

مودود نے ۴۴۴ھ / ۱۰۴۸ء میں اپنے دونوں بیٹوں ابوالقاسم محمود (یہ نام مشکوک ہے) اور منصور کو ایک ہی دن خلعت سے سرفراز کیا۔ محمود کو لاہور اور منصور کو پشاور میں متعین کیا۔ مودود اس کے اگلے سال ہی ۲۴ رجب ۴۴۵ھ / ۲۲ دسمبر ۱۰۴۹ء کو پرامرار حالات میں انتقال کر گیا۔ امیر علی بن ریح نے ساز باز کر کے مودود کے چار سالہ بیٹے مسعود ثانی کو تخت پر بٹھا دیا لیکن امیر باستگین

نے صرف پانچ چھ دن بعد جوای انقلاب برپا کر کے مسعود ثانی کو معزول کر کے اس کے چچا ابوالحسن علی بن مسعود اول کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد عبدالرزاق بن احمد بن حسن میمنہ نے ابوالحسن کے چچا ابو منصور رشید الدین کو زندان سے نکال تخت پر بٹھا دیا۔ ابوالحسن جیل بھیج دیا گیا۔ اس اثنا میں علی بن ربیع جس نے مودود کے چار سالہ بیٹے مسعود ثانی کو تخت پر بٹھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا عملاً پنجاب کا حکمران بن بیٹھا تھا۔ رشید نے اسے جیلوں سے غزنی بلایا اور اس کی جگہ نوش تگیں حاجب کو پنجاب کا گورنر بنا کر لاہور بھیجا جس نے کانگرہ کو دوبارہ فتح کیا۔ ادھر ۴۴۴ھ / ۱۰۵۳ء میں طغرل حاجب نے سلطان عبدالرشید کو اس کے خاندان کے نو افراد کے ساتھ قتل کر دیا اور خود سلطان بن بیٹھا۔ مگر نوش تگیں نے خفیہ خطوط کے ذریعے غزنوی امراء کی تمیت کو جگایا اور انہیں طغرل کے خلاف اقدام پر آمادہ کیا چنانچہ ایک دن طغرل کو سردار قتل کر دیا گیا۔

نوش تگیں نے غزنی پہنچ کر دوسرے امراء کے مشورے سے آل سبکتگین کی حکومت بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ بچے کھچے شہزادوں کی تلاش شروع ہوئی اور آخر بڑی دقتوں اور مشکلوں کے بعد تین شہزادوں کا سراغ ملا 'فرخ زاد' ابراہیم اور شاہ شجاع۔ تینوں مختلف قلعوں میں قید تھے۔ امراء نے قرعہ اندازی کے ذریعے متفقہ طور پر ابوشجاع فرخ زاد بن مسعود اول کو تخت پر بٹھایا۔ فرخ زاد چھ سال تک حکومت کرنے کے بعد تو لنج کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ اور ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء میں اس کا بھائی ابوالمظفر ابراہیم مصطفیٰ سے اٹھ کر تخت پر بیٹھا۔ اس نے عین عالم شباب میں دنیاوی لذتوں کو ترک کر دیا تھا۔ سال میں تین ماہ روزے رکھتا ہر سال اپنے ہاتھ سے ایک قرآن شریف لکھ کر ہدایہ کے ساتھ مکہ معظمہ ارسال کرتا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر کا شہر اجودھن اسی کے ہاتھ سے

فتح ہوا۔ اس نے روپڑ پر بھی اپنا پرچم لہرایا۔ سلطان ابراہیم تمام غزنوی بادشاہوں سے زیادہ عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد ۳۹۲ھ / ۱۰۹۹ء میں خالق حقیقی سے جا ملا۔ بعض مورخوں نے اسے بادشاہوں کے بجائے درویشوں میں محسوب کیا ہے۔ اور اسے "سید السلاطین" کا لقب دیا ہے۔^{۳۶}

ہمارے داتا صاحب اسی سلطان کے عہد حکومت میں لاہور تشریف لائے۔ داتا صاحب کا روضہ بھی اسی درویش صفت بادشاہ نے بنوایا۔

لاہور کا سیاسی انتظام

موجودہ لاہور داتا صاحب کے عہد سے پہلے کس قدر گمنام تھا اس کا ذکر ہو چکا۔ اس کی ناموری کا آغاز داتا صاحب کے زمانے سے ہوتا ہے۔ شروع میں گندوستان کی تسخیر محمود غزنوی کا مطمح نظر نہ تھی تاہم دواب کی مہموں سے دوران وہ اپنے مستقل مستقر سے بہت دور نکل آیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر بندھیل کھنڈ جیسے دور دراز مقامات تک ترکاڑیاں دکھانی ہیں تو پنجاب کو مکمل کنٹرول میں لائے وہاں سول اور فوجی انتظامیہ قائم کرنی ہوگی۔ اس نے موجودہ لاہور کو نئے صوبے کا صدر مقام بنانے کا فیصلہ کیا۔ ۲۲ - ۲۱ - ۲۱ (۳۱۲ھ) میں بڑی تعداد میں ٹھہری، لوہار سنگتراش اور معمار فوج کے ساتھ لے اور لاہور کو روانہ ہوا۔ راستے کو ایسے عناصر سے پاک کرتا گیا جو امن و امان کے لئے خطرناک ہو سکتے تھے۔ لاہور پہنچ کر مختلف علاقوں میں حاکم مقرر کئے اور چھاڑیاں قائم کیں۔^{۳۷} غالباً یہیں سے لاہور کی بنیاد ڈالنے کی روایت محمود سے وابستہ ہوئی اور بعض مورخوں نے اس میں ایاز کو بھی شامل کر لیا۔ لیکن اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ محمود نے موجودہ لاہور کی جگہ پر آباد سابقہ قلعہ مندگور میں یا اس سے قدرے ہٹ کر ایک قلعہ اور سول سیکرٹریٹ

تعمیر کیا۔ غالباً اسی کا نام محمود پور تجویز ہوا۔ یہ تعمیرات جلد ہی مکمل ہو گئی ہوں گی۔ کیونکہ لاہور کے عجائب گھر میں محمود پور کا ایک سکے موجود ہے جو ۱۹۳۹ھ / ۱۰۲۸ء میں ضرب ہوا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ محمود پور کا نام مقبول نہ ہو سکا اور صرف ریح صدی کے اندر سکوں پر لاہور ضرب ہونے لگا۔

سلطان محمود غزنوی نے لاہور کا سالار یا صوبیدار کسے مقرر کیا تھا؟ اس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ سب سے پہلے جو شخص اس عہدے پر ممکن دکھائی دیتا ہے وہ عبداللہ قراٹگین تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایرانی افسر علی ابوالحسن شیرازی کی پنجاب کے قاضی کے طور پر تقرری کا سراغ ملتا ہے۔ اختیارات دونوں کے برابر تھے کیونکہ جب قراٹگین کو محمود غزنوی کی زندگی میں ہی واپس بلایا گیا تو وزیر خواجہ احمد حسن میمندی نے جو قاضی شیرازی کو اپنا حریف سمجھتا تھا، طعنہ دیا کہ جرنیل قراٹگین قاضی سے دب گیا تھا۔

۵۴۲۰ھ / ۱۰۲۹ء میں یا اس سے کچھ پہلے عبداللہ قراٹگین کی جگہ حاجب اریارق صوبیدار یا سالار مقرر ہو کر لاہور آیا۔ قاضی علی شیرازی کی اریارق سے زبان سکی۔ اس اثنا میں وزیر خواجہ معزول ہو چکا تھا۔ وہ کالجبر کے قلعہ میں اور اس کا بیٹا عبدالرزاق قلعہ نندہ میں قید تھے۔ اریارق نے آتے ہی سراغ رسانی کے محکمہ کے افسر اعلیٰ..... (صاحب برید) کو ڈرایا دھمکایا کہ اس کے خلاف کوئی خبر سلطان کو بھیجی تو سر قلم کر دوں گا۔ اسی طرح عمال پر سخت رعب جمایا۔ معمولی نافرمانی پر سخت سزائیں دیتا بلکہ واقعی بے گناہوں کو مرداؤالتا۔ قاضی علی کی مسلسل تحریک پر ابوالفتح دامغانی اور ابوالحسن برج کرمانی عامل اور مشرف (شاہی محاسب) مقرر ہو کر لاہور آئے۔ مگر وہ بھی اریارق کو قابو میں نہ لاسکے۔

محمود نے اریارق کے ظلم و تعدی اور رزستانی کے قصے سنے تو اسے غزوے

طلب کیا مگر وہ نہ مانا جس پر مطعون اور مردود ہوا۔ اسی اثناء میں (۱۲۲۱ھ/۱۰۳۰ء) محمود انتقال کر گیا۔ اس کے جانشین محمد نے بھی اسے غزنی بلایا مگر وہ پھر ٹال گیا۔ محمد کی مختصر حکومت ختم ہونے پر مسعود تخت نشین ہوا، تو خواجہ احمد میمندی کو کالنجر کے قلعہ سے رہا کر کے غزنی طلب کیا۔ وہ لاہور سے گزرتے ہوئے اریارق کو سمجھا بچھا کر اور اپنی شفاعت کا یقین دلا کر ساتھ لیتے گئے۔ چند دن بعد جب وہ نشے میں دھت تھا تو طوق و سلاسل پہنا کر قید میں ڈال دیا گیا۔ وہ قید میں ہی مر گیا۔

اریارق کی جگہ ولایت لاہور کے بڑے اور بانام "عہدے پر محمود غزنوی کے ایک معتمد اور خازن احمد نیال تگیں (یا احمد اناتگیں) کی تقرری عمل میں آئی۔ یہ واقعہ ۱۲۲۲ھ/۱۰۳۱ء کا ہے۔ قاضی علی اپنے عہدے پر بقرار رہے۔ تاہم دونوں کی نگرانی کے لئے ابوالقاسم ابوالحکم کو صاحب برید مقرر کیا۔ محمود نے پنجاب میں دو عملی کی جو پالیسی وضع کی تھی اسے بحال رکھا گیا۔ احمد نیال تگیں کو ہدایت کی گئی کہ مال گزاری اور حساب کتاب میں دخل نہ دے۔ خواجہ احمد جو دوبارہ وزیر بن چکا تھا قاضی علی سے خاکھانا تھا۔ اس نے نیال تگیں کو قاضی کے خلاف بھڑکایا اور کہا اس شہزادی سے بچنا۔ وہ سالاروں سے اپنی فرمانبرداری کی توقع رکھتا ہے۔ دوسری طرف قاضی کو بھی مطلع کر دیا گیا کہ تمہارا کام مالیات کی نگرانی ہے۔ فوج اور فوجی کمان سے تمہارا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ نیا سالار احمد نیال تگیں اپنے فرائض اپنی صوابدید کے مطابق انجام دے گا۔ مواضعات کا خراج وصول کرے گا۔ اور جہاد کرے گا۔ اس دو عملی اور خواجہ احمد میمندی کی طرف داری کا یہ نتیجہ نکلا کہ لاہور آتے ہی دونوں میں محض گئی۔ احمد نیال تگیں نے اپنے فرائض کس خوبی سے انجام دیئے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نیال تگیں نے لاہور میں رہ کر اپنے محدود وسائل کو اس خوبی سے منظم کیا کہ ۱۲۲۴ھ/۱۰۳۳ء میں لاہور سے

آٹھ سو میل دور بنارس پر اپنا جھنڈا لہرایا۔ بنارس سے جو مال و دولت حاصل ہوئی وہ غزنی پہنچائی۔ مگر قاضی علی شیرازی نے خفیہ اطلاع بھیجی کہ نیال تگین نے خراج و غنائم کا بہت بڑا حصہ غائب کر دیا ہے اور سلطان کو جزو قلیل پر ٹر خا دیا ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق اس پر یہ اضافہ بھی کیا کہ ”اس کے ارادوں کا حال تو کسی کو معلوم نہیں تاہم وہ خود کو پسر محمد کہتا پھرتا ہے“ نیال تگین پہلے بھی قاضی شیرازی سے خوش نہ تھا مگر تمام دیوانی حکام قاضی کے ساتھ تھے لہذا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ بنارس سے فتحیاب واپسی سے اس کے حوصلے اتنے بڑھے کہ ۱۲۵۵ھ / ۱۰۳۷ء میں قاضی علی اور اس کے ساتھیوں پر چڑھ دوڑا۔ وہ تلوار سے مقابلہ نہ کر سکتے تھے لہذا قلعہ مندگور میں محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ گویا احمد نیال تگین کی طرف سے اعلان آزادی تھا۔

ہندو حجام کی سرفرازی

دربار غزنی میں صلاح مشورے شروع ہوئے۔ کوئی امیر نیال تگین کے مقابلے پر جانے کو تیار نہ ہوا۔ سب سے بڑا عذر گرمی اور ساون کا تھا۔ مسلمان افسروں کی لیت و بعل سے طیش کھا کر ایک ہندو سردار تنک حجام خنم ٹھونک کر میدان میں آیا۔ سلطان مسعود نے اسے سلطانی طبل و علم دے کر اس شان و شوکت کے ساتھ غزنی سے لاہور روانہ کیا کہ مسلمان امراء و لشکر سے ہونٹ کاٹتے تھے۔ تنک حجام کے لشکر نے لاہوری باغیوں پر اتنا اثر ڈالا کہ بہت سے سردار نیال تگین سے منحرف ہو گئے۔ شکست مقدر دیکھ کر بنارس کا فاتح احمد نیال تگین لاہور کے ایک حجام تنک سے لڑے بغیر بھاگ کھڑا ہوا۔ تنک نے قاضی علی اور ان کے ساتھیوں کو محاصرہ سے چھڑایا اور باغی سردار کا سر لانے والے کو پانچ لاکھ درہم انعام دینے کا اعلان کیا۔ نیال تگین کسی دریا کو عبور کرتا ہوا مارا گیا۔ اس کا کٹا ہوا سر اور امیر بیٹا تنک کے پاس لایا گیا۔ تنک یہ تحفے لے کر سلطان مسعود کے پاس حاضر ہوا۔ ”کسو تیش گراں بہا سے حجام سپہ سالار کا سر افتخار سے بلند کیا اور سلطان نے جواہر

کا طوق سرور بار اپنے ہاتھ سے اس کے گلے میں ڈالا۔ وہ مستقلاً سالار ہندوؤں کے
کے منصب پر فائز ہوا۔

امیر ایاز کی آمد

سلطان مسعود دو سال تک لاہور میں نیال تگین کے جانشین کا فیصلہ
نہ کر سکا۔ اس عرصہ میں غالباً قاضی علی شیرازی بلا شرکت غیرے ولایت لاہور پر
حکمرانی کرتے رہے۔ بالآخر ۳۷۷ھ / ۱۰۳۶ء میں اعطاردہ بیس سالہ شہزادے
مجدودین مسعود کو لاہور کی امارت تفویض کی گئی۔ تبین حاجب جو خود صاحب شکر
تھے اس کے ساتھ بھیجے گئے۔ ان میں اس کے دادا محمود کا محبوب امیر ایاز بھی شامل
تھا جسے مجدود کا اتالیق بھی مقرر کیا گیا تھا۔ ابوالقاسم علی نوکی کے فرزند ابو منصور
کو بطور دبیر سعد سلیمان (جس کے بیٹے مسعود نے بطور شاعر بڑی شہرت
حاصل کی) کو بطور مستوفی (وزیر مالیات) لاہور بھیجا گیا۔

سلجوقیوں کا عروج

۳۲۹ھ / ۳۸-۱۰۳۷ء میں سلطان مسعود نے ہندوستان کا اچھوتا قلعہ
فتح کرنے کی منت پوری کرنے کے لئے ہانسی اور سون پت پر حملہ کیا۔ وہ
لاہور نہیں آیا تھا بلکہ ملتان سے چڑھائی کی تھی۔ مسعود نے یہ ہم اپنے وزیر
کے مشورے کے خلاف سر کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مسعود اپنی پوری قوت سے
سلجوقیوں کا مقابلہ کرے جو یغزنی کے لئے خطرہ بنتے جا رہے تھے۔ مسعود
واپس پہنچا تو سلجوقی طلیقان اور فریاب پر قبضہ کرنے کے بعد رے کو محاصرہ
میں لے چکے تھے۔ امیر خراسان کو مقابلے کا حکم دیا تو اس نے اپنی بے باکی
کا عذر پیش کیا۔ مجبور کرنے پر میدان میں گیا۔ مگر جبری طرح شکست کھائی
اور یوں سارا خراسان سلجوقیوں کے زیر نگین آ گیا۔ اس سے اگلے سال سلطان

مسعود نے سرخس کے معرکہ میں سلجوقوں پر فتح حاصل کی مگر ان کی قوت کو ختم نہ کر سکا۔ مگر پھر ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء میں سلجوقوں سے شکست کھا کر ایسا بدحواس ہوا کہ میدان سے جان بچا کر نکلے اور غزنی پہنچ کر دم لیا۔ اپنے بیٹے مودود کو فوج دے کر بلخ بھیجا۔ مودود کو جولاہور کا امیر رضا ملتان میں متعین کیا۔ غزنی کا انتظام شہزادہ ایزدیار کے سپرد کر کے خود حرم اور اپنے والد کے ہندوستان سے حاصل کئے ہوئے خزانے تین سو اونٹوں پر لا کر لاہور کو روانہ ہوا۔ وزیر خواجہ محمد بن عبد الصمد روکتا رہ گیا مگر مسعود سلجوقوں سے ایسا خوفزدہ ہوا تھا کہ کسی کی نہ مافیہ مارگلہ کی پہاڑیوں میں پہنچا تو ترک اور ہندو غلاموں نے بغاوت کر کے سارا خزانہ لوٹ لیا اور مسعود کو قید کر کے گری کے قلعے میں ڈال دیا۔ — معزول بادشاہ محمد کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ✓

راولپنڈی کی بنیاد

جس وقت راولپنڈی میں یہ خونیں ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا مودود ملتان میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ جیسے اسے کچھ خبر ہی نہیں۔ اس کے بھائی مودود نے بلخ میں یہ خبر سنی تو غزنی کو بھاگا اور ایک لشکر بیکر بڑی تیز رفتاری کے ساتھ راولپنڈی کی طرف بڑھا جہاں چچا محمد کے لشکر سے مقابلہ ہوا۔ مودود کو فتح حاصل ہوئی۔ اس نے چچا اور اس کے بیٹے کو اسی جگہ (۴۳۲ھ / ۱۰۴۱ء) قتل کیا اور فتح آباد (راولپنڈی) کی بنیاد رکھی۔ اور غالباً اپنے بھائی پر اعتماد کرتے ہوئے واپس غزنی چلا گیا۔ جہاں تاجپوشی کی رسم ادا ہوئی۔

مودود کا خاتمہ

اس اثنا میں مودود نے یقیناً امیر ایاز کے مشورہ پر ہل کر کے ہندوستان میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دریائے سندھ سے لیکر

ہانسی اور تھاکسیر تک اپنی حکومت قائم کر لی۔ مودود نے اس سے اطاعت کا مطالبہ کیا جسے اس نے نامنظور کر دیا۔ ۵۴۳ھ / ۱۱۴۲ء میں مودود نے لاہور کا رخ کیا۔ مجدد ان دنوں ہانسی میں بیٹھ کر دہلی پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ مودود کے ارادہ کی اطلاع پا کر مجدد لاہور پہنچا اور مقابلہ کے لئے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ دونوں بھائیوں کے لشکر آمنے سامنے تھے۔ خونریز جنگ ہونے کو تھی کہ عین عید الفتحی ۵۴۳ھ / ۱۱ جولائی ۱۱۴۲ء کو مجدد اپنے خیمے میں مردہ پایا گیا۔ امیر ایاز معزول ہوا، اور پندرہ سولہ سال گناہی میں بسر کرنے کے بعد ۵۴۹ھ / ۱۱۵۷ء میں انتقال کر گیا۔ رنگ محل لاہور میں اسی امیر ایاز کا مزار بنایا جاتا ہے۔

لاہور پر ہندوؤں کا حملہ

مودود نے لاہور پر قبضہ کر کے حکومت کس کے سپرد کی؟ فوجی انتظامات کس کے حوالے کئے؟ اس ضمن میں تاریخ بالکل خاموش ہے۔ اگلے سات برسوں میں لاہور غالباً بے ملک رہ گیا تھا۔ مختلف علاقوں میں کوئی نہ کوئی انتظام ضرور ہوگا۔ مگر اس میں کوئی مرکزیت نہ تھی۔ ہندوؤں نے اس سیاسی اور فوجی خلا سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دہلی کے راجہ کی قیادت میں انہوں نے یکے بعد دیگرے ہانسی، تھاکسیر اور پٹھانکوٹ کے قلعے غزنویوں سے تحصین لئے یہاں تک کہ ۵۴۵ھ / ۱۱۴۴ء کے لگ بھگ ہندو لشکر لاہور کے نواح پر بھی حملے کرنے لگے۔ اس وقت امرائے لاہور باہم دست و گریباں تھے۔ بالآخر جب لاہور بھی ہاتھ سے جانا دکھائی دیا تو خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ مودود کی اطاعت کا حلف اٹھایا اور متحد ہو کر ہندوؤں کے مقابلے کو نکلے۔ ہندو اب تک ان کے نفاق سے فائدہ اٹھا رہے تھے مگر اب انھیں متحد دیکھ کر محاصرے کا خیال چھوڑ کر پسا ہو گئے۔ آخر کار کہیں ۵۴۸ھ / ۱۱۴۸ء میں مودود کو لاہور کی بے نظمی کا خیال آیا اور اس نے اپنے ایک بیٹے منصور کو پشاور کا اور دوسرے کو لاہور کا امیر مقرر کیا۔ فرشتے نے اس کا نام ابوبق اسم محمود لکھا ہے۔ لیکن مولانا ہاشمی کو اس سے اختلاف ہے۔ کہتے ہیں

کہ مودود نے اپنے جس بیٹے کو لاہور کا امیر مقرر کیا، اس کا نام کچھ اوزر ہوگا۔ کیونکہ ابوالقاسم محمود نامی جو شہزادہ بعد ازاں امیر لاہور مستقر ہوا وہ سلطان ابراہیم کا بیٹا تھا۔ ابھی نیا انتظام مستحکم نہ ہو سکا تھا کہ اگلے سال ۱۱۴۴ھ/۱۰۵۹ء میں سلطان مودود کا انتقال ہو گیا اور خود غزنی میں وہ افراتفری مچی کہ تخت کے پائے پل گئے۔ دس برس کے عرصہ میں چھ بادشاہوں کا عزل و نصب ظہور میں آیا۔

علی بن ربیع کی بغاوت

مودود کے بعد پنجاب کا کیا بنا؟ اس کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا۔ بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ غزنی کے ایک امیر علی بن ربیع نے مودود کے چار سالہ بیٹے ابوجعفر مسعود (ثانی) کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور اس کے پردے میں خود حکومت کرنے لگا۔ دوسرے امر اخصر مہا باستگین کو یہ جانشینی پسند نہ آئی اور انہوں نے متفق ہو کر مسعود ثانی کو چند دنوں کی حکمرانی کے بعد معزول کر دیا اور ابوالحسن بن مسعود اول کو تخت پر بٹھا دیا مگر اسی سال ۱۱۴۴ھ/۱۰۵۹ء میں اسے عبدالرشید نے تخت سے محروم کر دیا۔ ابوالحسن نے فقیری اختیار کر لی۔ علی بن ربیع اپنے مہرے (مسعود ثانی) کے پٹ جانے کے بعد جس قدر زر و جواہر سمیٹ سکا سمیٹ کر پشاور بھاگ گیا۔ وہاں مودود کا بیٹا منصور متین تھا۔ پتہ نہیں اس کا کیا بنا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ علی بن ربیع نے ملتان اور سندھ کے علاقے پر قبضہ جما لیا۔ سلطان عبدالرشید نے حیلوں پہانوں سے علی بن ربیع کو واپس غزنی بلایا اور ہندوستان میں نظم و نسق بحال کرنے کے لئے حاجب نوشتگیں کو ۱۱۴۳ھ/۱۰۵۸ء میں ولایت لاہور کا والی مقرر کیا اور اپنے برادر نسبتی طغرل حاجب کو سندھ اور کرمان کی طرف بھیجا۔

غزنی میں ایک اور انقلاب!

لاہور کے نئے حاکم نوشتگیں کے متعلق ہماری معلومات کا سارا ذخیرہ بس اتنا سا ہے کہ اس نے پنجاب میں امن و امان بحال کیا۔ نظم و نسق کی اصلاح کی اور پھر طوفانی

حملہ کر کے کانگڑہ کو بندوڑوں سے چھین لیا۔ اس کے علاوہ شمالی سرحد کو بندوڑوں سے پاک کیا۔ نوش تگین ابھی پنجاب میں مستحکم حکومت قائم نہیں کر سکا تھا کہ طغرل نے اپنی بہم سے واپس آکر ۵۴۴ھ / ۱۰۵۲ء میں اپنے برادر نسبتی سلطان عبدالرشید کو گھیر کر مار دیا اور اسکے ساتھ آل سبکتگین کے نو افراد کو بھی قتل کر دیا، جو تخت کی دعویداری کر سکتے تھے۔ یہ خبر سن کر نوش تگین پشاور پہنچا۔ طغرل نے اسے بھی پھانسا چاہا، مگر منہ توڑ جواب پایا۔ نوش تگین نے دوسرے امیروں کو بھی غیبت دلائی تو انھوں نے متحدہ اقدام کر کے طغرل کو جسے کافر نعمت کا لقب دیا گیا ہے، قتل کر دیا۔

اسکے بعد نوش تگین غزنی پہنچا تو تمام امراء سے یہ بات منوالی کہ آل سبکتگین کی حکومت بحال کر دی جائے لیکن اب مصیبت یہ تھی کہ کوئی شہزادہ ڈھونڈے نہ ملتا تھا۔ آخر بڑی تلاش کے بعد تین شہزادوں کا سراغ ملا جو مختلف قلعوں میں قید تھے: فرخ زاد، ابراہیم اور شاہ شجاع۔ ان میں سے فرخ زاد کو بذریعہ قرعہ اندازی ۵۴۴ھ / ۱۰۵۲ء میں سلطان مقرر کیا۔ فرخ زاد کے سات سالہ دور اقتدار میں لاہور کا نظم و نسق کس کے سپرد تھا یا اس اثنائے میں لاہور پر کیا بیٹی؟ اس کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ تاہم مولانا ہاشمی نے بعض قرائن سے اندازہ لگایا ہے کہ اس عرصہ میں ابوبکر صالح جو بعد ازاں فرخ زاد کا وزیر بنا، لاہور کا والی تھا۔ اسی زمانے میں یا فرخ زاد کے جانشین، سلطان ابراہیم کے اوائل عہد میں نجم الدین شیبانی کو لاہور کا والی مقرر کیا گیا تھا۔

لاہور کا نیا حاکم

۵۴۵ھ / ۱۰۵۹ء میں سید السلاطین ابوالمظفر رضی اللہ عنہ بن مسعود تخت نشین ہوا۔ اس کے فضائل پر پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے — سیف الدولہ ابوالفتح اسمعیل بن محمود کو غالباً ۵۴۹ھ / ۱۰۵۳ء میں لاہور کا والی مقرر کیا، لاہور کی قدیم و جدید تواریخ میں اس شہزادے کی ولایت لاہور کا کوئی ذکر نہیں ملتا، مولانا ہاشمی نے پہلی مرتبہ بڑی عرق ریزی سے مسعود سعد سلمان اور الفرج مسعود روڈانی

کے قصائد سے اس کا تذکرہ مرتب کیا ہے۔

ابولہق اسم کو دربار غزنی سے سیف الدولہ کا خطاب ملا اور پھر ہندوستان کی امارت پر فائز ہونے کے وقت خلیفہ بغداد نے "ضیاع امیر المومنین" کے خطاب کا اضافہ کیا۔ شہزادہ محمود کے مرتبے کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، اسے سر پر تاج رکھنے کی اجازت تھی اور اسے قریب قریب شاہی القاب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ شہزادہ محمود نے پنجاب میں نظم و نسق اور صنعت و تجارت کی بحالی پر توجہ مبذول کی اور جلد ہی لاہور کی پرانی عظمت ہی بحال نہ کر دی بلکہ اس میں مزید اضافہ کیا۔

لاہور کی امارت کے دوران اس کا سب سے بڑا کارنامہ آگرہ کی فتح ہے۔ اس نے یہ حملہ رو پیسہ حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ محض جہاد کا ثواب حاصل کرنے کے لئے کیا تھا۔ آگرہ کی مہم کے لئے اس نے چالیس ہزار سواروں کا لشکر لاہور سے ہی انتخاب کیا تھا۔ جس شہر سے چالیس ہزار سوار چھانٹ کر علیحدہ کئے جاسکے اسکی مجموعی آبادی یقیناً لاکھوں میں ہوگی۔ اس کے عہد میں لاہور تعمیرات اور ثقافت میں غزنی کا ہم پلہ بن گیا۔

کسی بدخواہ نے سلطان ابراہیم کے کان بھرے کہ اس کا بیٹا شہزادہ محمود اس کے دشمن ملک شاہ سلجوقی کے پاس عراق جانے کی سوچ رہا ہے۔ سلطان ابراہیم نے سن ۱۰۸۷ء میں اسے معزول کر کے قید میں ڈال دیا۔ اس کی جگہ ایک اور بیٹے علاء الدولہ کو پنجاب کا والی مقرر کیا۔ یہی مسعود بعد ازاں مسعود ثالث کے نام سے غزنی کا تاجدار بنا۔

اس کے زمانہ امارت ہند کے متعلق بس اتنا ہی معلوم ہے کہ اس نے ہندوستان میں جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کی امارت کا زمانہ سن ۱۰۸۷ء / سن ۱۰۹۲ء / سن ۱۰۹۹ء کے درمیان تخمین کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی داتا صاحبؒ کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے، ورنہ اس کے جانشین بھائی شیرزاد نے سن ۱۰۹۳ء / سن ۱۱۰۰ء میں ہندوستان

کا والی مستر ہونے کے بعد لاہور کو جو ترقی دی وہ بے مثال تھی

مرکز ثقافت

دانا صاحب کے عہد کا لاہور شمشیر زنی کا ہی مرکز نہ تھا، بلکہ بقول عوفی: "ایک خطہ بفضل لامتناہی ادب ساثر بلاد و مفاخر و مباہی" — بھی تھا۔ ساتویں صدی ہجری کے اس تذکرہ نگار نے مسلم لاہور کے جس پہلے شاعر کا ذکر کیا ہے وہ سلطان مسعود اول — ۴۱۶ تا ۴۳۲ھ / ۱۰۳۰ تا ۱۰۴۱ء کے زمانہ کا شاعر ابو عبد اللہ روز بہ ابن عبد اللہ النکتی اللہوری ہے، ایرانی الاصل تھا۔ اس کا باپ الحاق پنجاب کے بعد ہی لاہور میں آگیا تھا۔ اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں!

لاہور کا پہلا نامی شاعر ابو الفرج بن مسعود الرومی ہے۔ جو مولانا ہاشمی کی تحقیق کے مطابق الحاق لاہور سے چند سال بعد ۴۲۴ھ / ۱۰۳۵ء میں لاہور کے ایک گاؤں روتہ میں پیدا ہوا جس کا اب نشان تو کیا — نام بھی نہیں ملتا۔ الفوری نے اسی کا ایک شعر چرا کر بدنامی مولیٰ تھی — رونی کسی ذی وجاہت خاندان کا فرد نہ تھا۔

مسعود سعد سلمان کو لاہور کے شاعروں میں ممتاز مقام حاصل ہے، اسکے والد سعد سلمان شہزادہ مجدد کے ساتھ مستوفی بن کر لاہور بھیجے گئے — املاً ہمدان کے رہنے والے تھے، لاہور میں انہیں جاگیر ملی تھی اور وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے تھے۔ مسعود کی پیدائش لاہور میں ہوئی — اسے لاہور سے جو محبت تھی اس کا اظہار کئی قصائد اور قطعات میں کیا ہے۔ ۴۹۲ھ / ۱۰۹۸-۹۹ء میں یا کچھ بعد اسقال کیا بعض روایات کے مطابق وہ غزنی میں مدفون ہوا، مگر اس کی کوئی سند نہیں! مزنگ لاہور میں اس کی قبر دکھائی جاتی ہے اور اگر یہ درست ہے تو پھر اسے عہد غزنوی کی دو اثری نشانیوں مزار داتا گنج بخش اور مزار امیرایاز کے ساتھ ایک اضافہ سمجھنا چاہیے۔

اسکی عمر کا کافی حصہ خلیل خاؤن میں گزرا، قیدی اس نے جو شاعری کی — وہ بے مثال ہے۔ اسی لئے وہ جیسے شاعری کا امام کہلاتا ہے۔ مسعود فارسی کے ساتھ عربی میں

بھی شعر کہتا تھا۔ مسلم لاہور کا یہ پہلا شاعر ہے جو پنجابی میں بھی شعر کہتا تھا بلکہ پنجابی کا صاحب دیوان شاعر تھا۔

مولانا ہاشمی مرحوم نے مسعود سعد سلمان کی ایک مثنوی کے ذریعے داتا صاحب کے عہد کے فرائد کے امراٹے دولت سے روشناس کرایا ہے۔ داتا صاحب کے زمانہ میں بھی امراٹے لاہور کی معاشرت کچھ مختلف نہ ہوگی۔ خواجہ ابو نصر کسی کونشہ چڑھتا ہے۔ تو شاہنامے کے سینکڑوں شعر پڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر چلتے چلتے ایک پیائے پر اور ہاتھ مارتا اور امیر لاہور کو دعائیں دیتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے۔ امیر بہمن نیک نام خاندانی امیر ہے آداب تہذیب سے خوب واقف ہے۔ لطافت میں کوئی مد مقابل نہیں۔ سید ابوالفضائل۔ جگر شیر کا اور بدن ہاتھی کا۔ اس کے دم قدم سے مجلس کی رونق ہے۔ شہزادہ دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اسے مست کرنے کے لئے چھ قدم درکار ہیں، حسین طبیب اپنے فن کا ماہر ہے۔ جالینوس کی غلطیاں نکالتا ہے۔ نزد کھیلنے کا شائق ہے!

اسی مثنوی میں مسعود سعد سلمان نے دربار لاہور سے وابستہ بعض ارباب طرب سے بھی تعارف کرایا ہے، مثلاً محمد نے نواز بانسری بجانے میں کمال رکھتا ہے..... عثمان نامی گویے کے ذکر سے اس وقت کے لاہور میں قحبہ خانوں کے وجود کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اسفندیار چنگ بجانے میں جواب نہیں رکھتا۔ ہمیشہ خلعت و نقد سے نوازا جاتا ہے مگر جھٹے کا ایسا چسکا پڑتا ہے کہ دربار سے نکلے ہی خلعت شاہی کو پیچ کر خانے میں جا پہنچتا ہے اور کبشرواں سے صرف پا جامہ پہنے گھر جاتا ہے۔ ایک سرود نواز چھوکر بڑی قدر رکھتا تھا، مگر امیر لاہور سے بھاگ کر قحبہ خانے میں جا چھپتا ہے۔ اس طرح ایک مطرب پری اور بانو قوال اور رقاص ماہو کا تعارف کرایا گیا ہے۔

مسعود سعد سلمان نے اپنی مثنوی "شہر آشوب" میں ہمیں لاہور کے جن پیشہ ورانہ سے تعارف کرایا ہے: ان میں قصاب، نان بائی، رنگریز، کسان، سقے، تاحبر، زرگر، لوطی، مستری، معمار، تیرگر، باغبان، عطار، طبیب، منجم، قال گیر، ملاح، تیراک، پہلوان، چوگان باز، کبوتر باز، پارچہ ہاف، منبر فروش، جوہری اور علماء

میں قاضی - فقیہ - مہندس - فلسفی - صوفی - قلندر اور واعظ وغیرہ شامل ہیں۔

یہی وہ لوگ ہوں گے جن میں داتا صاحب کے شب و روز بسر ہوتے ہوں گے، یقیناً اسی معاشرت کے باعث داتا صاحب نے کشف المحجوب میں جگہ جگہ طبعیہ امرار سے کراہت کا اظہار کیا ہے۔ غالباً یہی وہ لوگ تھے جن کی صحبت کو داتا صاحب نے ناجنسوں میں گرفتاری قرار دیا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ دنیا دار بھی اس نظام سے خوش نہ تھے۔ مسعود سعد سلمان نے گلہ کیا کہ کسپ حلال میں پوری نہیں پڑتی۔ علم و ادب کی بے قدری کا گلہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے سعادت کو نصیحت کرتا ہے کہ آج کل علم و فضل کی ایسی مٹی پسید ہوئی ہے کہ تمہیں تاک کرنا ہوں کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ دے۔ اگر دنیا میں بھلائی چاہتے ہو تو جولاہے کا پیشہ اور عیب و جہالت کا راستہ اختیار کرو۔

غزنوی جو داتا صاحب کے زمانہ حیات سے تقریباً نصف صدی قبل، ایک شاندار اور بے حد متمول سلطنت کے طور پر دنیا سے اسلام کے نقشے پر ابھرا تھا۔ داتا صاحب کی حیات کے تقریباً پچاس سال بعد ہی علاء الدین غوری "جہاں سوز" کے ہاتھوں اس طرح خلا کہ اسکا کچھ بھی نہ بچا۔

غزنوی خاندان کے آخری دو سلاطین یعنی ظہیر الدولہ خسرو شاہ (متوفی ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء) اور سراج الدولہ خسرو شاہ نے ۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء میں شہاب الدین محمد بن سام کے ہاتھوں شکست کھانے تک اپنا مرکز اسی لاہور کو بنایا۔ لیکن وہ لاہور جو داتا صاحب کے زمانہ میں عالم وجود یا عالم شہود میں آیا تھا۔ اور جسے غزنویوں نے ترقی دے کر بغداد - بخارا و سمرقند کا ہمسر بنا دیا تھا۔ وہ بھی داتا صاحب کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء مغلوں کے سپہ سالار طائر کے لشکر کے ہاتھوں اس طرح برباد ہوا کہ نہ تو کوئی ذی تنفس زندہ بچا، اور نہ کوئی عمارت محفوظ رہی۔ تیس سال بعد سلطان غیاث الدین بلبن نے اس ویرانے کو زرخیر صرف کر کے دوبارہ آباد کیا۔

داتا صاحب لاہور میں

”کشف المحجوب“ سے پتہ چلتا ہے کہ داتا صاحب نے سنزنی سے آکر لاہور میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے مغتوم ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا تھا۔ اور غالباً اسی دوران ہندو عقائد سے واقفیت حاصل کی۔ مثلاً اولیاء پر انبیاء کی فضیلت کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرقہ حشوبہ (اہل تجسیم جو خدا تعالیٰ کے جسم کے قائل ہیں) اور مشیمین (اللہ تعالیٰ کے عام لوگوں سے مشابہ جسم کے قائل) کے عقائد کو رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ :

یہ دو فکروہ جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں انبیاء کی تخصیص و فضیلت کی نفی کے بارے میں برہمنوں سے متفق ہیں اور جو شخص انبیاء کی تخصیص کی نفی کا اعتقاد رکھے وہ کافر ہوتا ہے۔

اس کے بعد روح کی حقیقت کے بیان میں روح کو قدیم جان کر اس کی پرستش کرنے اور ارواح کو قدیم و مدبر عالم ماننے اور روح کے ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف پلٹ جانے کا نظریہ رکھنے والوں میں نصاریٰ، شیعوں، قرامطیوں اور باطنیوں کے ساتھ ہندوؤں اور بدھوں کو بھی شامل کیا ہے۔

یہ امر دلچسپی کا باعث ہو گا کہ داتا صاحب نے بدھوں کا نام نہیں لیا، بلکہ انکا ذکر اہل تبت اور چین و ماچین والوں کے طور پر کیا ہے۔ پنجاب میں داتا صاحب کے پیشرو

البیرونی نے بھی بدھ مت سے اغماض برتا ہے۔ کتاب الہند کے مترجم ایڈورڈ سی زخاؤ نے بھی بدھ مت کو نظر انداز کر دینے پر تعجب کا اظہار کیا، اور اسکی وجہ یہ قیاس کی ہے کہ غالباً گیارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں وسطی ایشیا، خراسان، افغانستان اور شمال مغربی ہندوستان سے بدھ مت کے تمام آثار مٹ چکے تھے۔ زخاؤ کے اس خیال کی تصدیق کشف المحجوب کی مذکورہ عبارت سے بھی ہوتی ہے جسکے مطابق بدھ مت ثبت اور چین میں ہی رہ گیا تھا۔

محمود کی تلوار و صوفی کی محبت

ہندوؤں کے عقائد کا بیان کشف المحجوب کے اصل موضوع سے خارج تھا۔ تاہم مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے عقائد و نظریات کے ضمن میں ہندو عقائد کا حوالہ دیئے جانے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ داتا صاحب ان سے بخوبی آگاہ تھے۔ یہ آگاہی ذاتی تحقیق کا نتیجہ تھی یا البیرونی کی کتاب الہند پر مبنی تھی؟ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ تاہم موسیقی کے باب میں دیئے گئے ایک حوالہ سے اشارہ ملتا ہے کہ کتاب الہند داتا صاحب کی نظر سے گزر چکی تھی۔ ہندوستان میں جہاں کے علماء اپنے سوا کسی کو خطہ میں نہ لاتے تھے۔ اسلام کی تبلیغ کے لئے ہندوؤں کے عقائد سے واقفیت حاصل کرنا ضروری امر تھا۔

چونکہ داتا صاحب کے پیش نظر صرف تبلیغ تھی، لہذا محبت کے باب میں اشاعت دین کے لئے تلوار پر زبان کی فوقیت ظاہر کرتے ہوئے ایک بزرگ کا یہ مقولہ پیش کرتے ہیں کہ ”ہندوؤں میں محمود کی تلوار کا غلام بننے کی بہ نسبت محبت کا غلام بننے کی رغبت زیادہ پائی جاتی ہے“

داتا صاحب نے کشف المحجوب میں ہندوستان میں اپنی سیاحت کے تجربات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ،

”میں نے ہندوستان میں دیکھا ہے کہ زہرہ قاتل میں ایک کیر پیدا ہو جاتا

ہے اور اس کی زندگی اس زہر پر ہی موقوف ہوتی ہے اس لئے کہ وہ ہمہ تن زہری ہوتا ہے۔“

داتا صاحب کے سماع کے باب میں انسانوں اور جانوروں پر آواز خوش اور غمناک ساز کے اثرات بیان کرتے ہوئے خراسان اور عراق کی طرح ہندوستان میں موسیقی کے ذریعے شکار کا طریقہ بتایا ہے۔ لکھتے ہیں،

”ہندوستان میں ایک جماعت ہے جو باہر جنگل میں جا کر سریلی آواز میں گاتی ہے۔ جب ہرن ان سریلی آوازوں کو سنتے ہیں تو ان کی طرف دوڑ آتے ہیں، لوگ ان کے گرد گھومتے اور گاتے بجاتے ہیں، یہاں تک کہ راگ کی لذت کے باعث ہرن آنکھیں بند کر کے سو جاتے ہیں اور پھر وہ شکاری ان کو پکڑ لیتے ہیں۔“

کشف المحجوب کی یہ عبارت البیرونی کی کتاب الہند کا ایک اقتباس لگتی ہے۔ البیرونی موسیقی کے ذریعے شکار کے ہندوستانی دعوے کی قلعی کھولتے ہوئے لکھتا ہے، کہ اس کی وجہ کوئی جادو ٹونا نہیں بلکہ میری رائے اور تحقیق کے مطابق یہ ہے کہ جانوروں کو مسلسل ایک ہی دھن سنا کر اس کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔ ہمارے لوگ تو موسیقی کے ذریعے IBEX کو شکار کر لیتے ہیں، جو ہرن سے کہیں زیادہ وحشی ہوتا ہے۔ داتا صاحب نے ہرن کے گرد گاتے بجاتے ہوئے چکر لگانے کا جو طریقہ ہندوستان سے منسوب کیا ہے اسے البیرونی نے اپنے لوگوں، کا قاعدہ بتایا ہے۔ عین ممکن ہے کہ داتا صاحب نے ہندوؤں کو محبت کا غلام بنانے سے متعلق کسی بزرگ کا جو مقولہ عربی میں پیش کیا ہے وہ بھی البیرونی کا ہو۔

لاہور میں غازی

ایک پہلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ داتا صاحب کی لاہور میں تشریف آوری کے وقت مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد پنجاب کے مختلف حصوں میں آباد ہو چکی تھی۔

یہاں تک کہ حضرت اسماعیل بخاریؒ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ ۵۳۹ھ / ۱۱۰۴ء میں لاہور آئے تھے۔ اس وقت لاہور پر جے پال کی حکومت تھی، جس نے شیخ اسماعیلؒ کی آمد سے سات سال پہلے لاہور کے بانی راجہ کے پوتے جیندرت کو شکست دی تھی۔

لاہور پر محمود کا قبضہ شیخ اسماعیلؒ کی تشریف آوری کے پندرہ سولہ سال بعد ہوا۔ شیخ اسماعیلؒ کی تبلیغ سے پہلے ہی جمعۃ المبارک کو ڈھائی سو، دوسرے جمعہ کے وعظ سے سارے تین سواور تیسرے جمعہ کو پانچ سو ہندو مسلمان ہوئے تھے۔

۵۴۸ھ / ۱۱۵۲ء میں ان کی رحلت کے وقت تک لاہور میں نو مسلموں کی تعداد جہاں تک پہنچ چکی ہوگی، اس کا ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ محمود کے ہاتھوں پنجاب کی فتح کے بعد لاہور میں افغانستان اور ایران سے آنے والے مسلمانوں کی آبادی بھی قابل لحاظ ہو گئی تھی۔ اور یوں لاہور اُچکل کی اصطلاح میں کاسموپولٹن شہر بن گیا۔

میتا

دانا صاحب کے زمانہ میں لاہور کی آبادی کے ایک حصہ کا تذکرہ مزدوری معلوم ہوتا ہے۔ مؤرخوں نے اسے "غازیوں" کا نام دیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو عالم اسلام کے مختلف گوشوں سے محض جہاد کا ثواب حاصل کرنے کے لئے محمود کے لشکر میں آن شامل ہوتے تھے۔ غازیوں کو مستقل شکر کی طرح تنخواہ نہیں ملتی تھی، البتہ بعض اوقات اسلحہ مل جاتا تھا۔ یہ غازی صرف مال غنیمت پر گزر بسر کرتے تھے۔ ۵۳۹ھ / ۱۱۰۱ء میں پشاور اور ویہند کی مہموں میں دس ہزار غازی شریک تھے۔ ۵۴۰ھ / ۱۱۱۸ء میں قنوج کی مہم میں دواؤں النہر کے بیس ہزار غازی شامل تھے۔

سومناہ کی مہم میں محمود نے غازیوں کو اسلحہ خریدنے کے لئے پچاس ہزار دینار اپنے خزانے سے دیئے تھے۔ مفتوحہ علاقوں کی حفاظت پر بھی غازی ہی مامور کئے جاتے تھے۔ مسعود کے عہد میں "سالار غازیوں" کا ایک عہد قائم ہو گیا تھا۔ جس کا صدر مقام لاہور تھا اور ایک ترک غلام عبداللہ قراتگین "سالار غازیوں" کے عہدے پر فائز تھا۔ ان غازیوں میں مختلف عقائد کے لوگ ہوتے ہوں گے۔ اور اگر ان میں کچھ متعبد

صوفیوں کی ہو تو ہمیں چنداں تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس گمان کا سبب کشف المحجوب
ہی کی ایک عبارت ہے۔

دانا صاحبؒ نے سفر میں آداب محبت پر روشنی ڈالتے ہوئے کسی صوفی کیسے

سے اقامت ترک کر کے سفر اختیار کرنے کی یہ شرط رکھی ہے کہ سفر نفس کی متابعت کے
لئے نہ ہو۔ بلکہ محض اللہ کے لئے ہو، اللہ کے لئے سفر کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اسے حج،
زیارت، علم یا غزوہ کے لئے اختیار کیا جائے۔ بصورت دیگر صوفی سفر میں
خطا وار ہوگا۔

مختلف عقائد کے لوگ

پنجاب میں مختلف عقائد کے مسلمانوں کی موجودگی کا ثبوت کشف المحجوب کی ایک
عبارت سے بھی ملتا ہے۔ عقائد و بت کے باب میں درتہ خرازیہ کے عقائد پر بحث کرتے
ہوئے لکھا ہے کہ ایک گروہ نے فنا و بقا کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس گروہ کا
خیال ہے کہ فنا یہ ہے کہ اپنی ذات کو خدا میں مدغم کر کے نیست و نابود ہو جائے اور بقا یہ ہے
کہ حق تعالیٰ کی بقا بندہ میں شامل ہو جائے۔ دانا صاحب لکھتے ہیں کہ :

”یہ دونوں باتیں محال ہیں۔ میں نے ہندوستان میں ایک آدمی کو

دیکھا جو تفسیر و تذکیر اور علم کا مدعی تھا۔ اس نے اس موضوع پر

مجھ سے مناظرہ کیا، اسکی باتوں پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص

نہ تو فنا و بقا کو جانتا تھا اور نہ ہی قدیم اور محدث میں فرق کر سکتا تھا

اور جاہلوں میں ایسے لوگ بہت ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور میں دانا صاحب کا مشن صرف ہندوؤں کو مسلمان بنانا ہی

نہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ مہتمم بالستان تھا، یعنی مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح۔

دانا صاحب نے یہ دو ہر مشن جس کامیابی کے ساتھ پورا کیا، اسکی وضاحت ضروری ہے

دلرا شکوہ کے الفاظ میں :

”اس اطراف کے بھی باشندے آپ کے مرید و معتقد ہو گئے۔

لاہور ایکسٹرا اور متبرک شہر ہے“

داتا صاحب نے لاہور میں جس طرح اپنا مشن انجام دیا، اسکی تفصیل کہیں بھی نہیں ملتی۔ تاہم کشف المحجوب کی دہلی شہادتوں سے جو مبہم سا خاکہ ذہن میں اُبھرتا ہے۔ اسکے پیش نظر بے اختیار ہو کر داتا صاحب سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے :

داتا صاحب کی تمنا

داتا صاحب نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بلاد اسلامیہ کی سیاحت میں بسر کیا مگر کسی ایک جگہ بھی سفر کی مصوبتوں کا گلہ نہیں کیا۔ ہاں لہجہ جب اپنی سیاحتوں کے دوران کسی گدڑی پوش کو ہاتھ پھیلائے دیکھتے یا کبھی خود آپ کو کسی کے مجبور کرنے پر یہ کام کرنا پڑتا تو دل خون کے آنسو رونے لگتا۔ بے شک داتا صاحب نے مریدوں کی تربیت کے دوران فخر اور سرور کو دماغ سے نکلنے کے لئے ”سوال“ کی اجازت دی ہے۔ مگر اس پر کڑی پابندیاں کر دی ہیں مثلاً کسی جگہ سے دھتکارے جانے پر خوشی محسوس کرے۔ اور اپنے اور خدا کے درمیان کسی شخص کو حائل نہ سمجھے۔ عورتوں اور بازاری لوگوں سے سوال نہ کرے۔ صرف اسی شخص سے سوال کیا جائے جسکے مال کے حلال ہونے کا یقین واقع ہو، صرف وقت کی ضرورت کے مطابق سوال کیا جائے، کل کی ضرورت کا خیال نہ کرے تاکہ ہمیشہ کی تباہی میں گرفتار نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی گدائی کا حال نہ بتائے۔ لیکن جب داتا صاحب کسی جگہ یہ حال پھیلا ہوا دیکھتے تھے تو تڑپ جاتے تھے۔ لکھتے ہیں :

”ایک دفعہ میں اپنے شیخ کے ہمراہ آذربائیجان میں جا رہا تھا کہ

دو تین گدڑی پوشوں کو دیکھا۔ وہ گندم کے ایک ڈھیر پر اپنی

گدڑیوں کے پلو پھیلائے کھڑے تھے۔ کسان نے ان میں

کچھ غلہ ڈال دیا۔ میرے شیخ نے ان کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی

— ”یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے مگرابی خرید لی، پس ان کی تجارت کچھ نفع مند نہ ہوئی اور دراصل وہ ہدایت پانے والے نہ تھے۔“ میں نے پوچھا: ”اے شیخ! یہ لوگ کس وجہ سے اس بلا میں مبتلا ہیں اور مخلوق کے سامنے رسوا ہوئے ہیں؟“ — انھوں نے فرمایا: ”ان کے پیروں کو مرید جمع کرنے کی حرص تھی اور انہیں دنیا جمع کرنیکی اور کوئی حرص بھی دوسری حرص سے بہتر نہیں ہوتی۔“

سوال سے اپنی کراہت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”مجھے اپنے سفروں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بات ناگوار، اور رنج دہ نہیں تھی کہ جاہل خادم اور بے خوف مقیم مجھ کو اپنے ساتھ لے لیتے اور کبھی اس خواجہ کے گھر اور کبھی اس زمیندار کے گھر لے پھرتے اور میں دلی کراہت سے ان کے ساتھ چلتا اور بظاہر درگزر کرتا۔“

پھر اس ضمن میں اپنے ایک عہد کا اعلان کرتے ہیں:

”مقیم لوگ مجھ سے جو بے قاعدگیاں کیا کرتے تھے میں ان کی وجہ سے دل میں عہد کر لیتا کہ اگر میں کسی وقت مقیم ہو جاؤں گا تو مسافروں سے کبھی ایسا سلوک نہ کروں گا۔“

لاہور میں شہر فیض

طاہر صاحب نے بتایا ہے کہ مقیم وہ ہوتا ہے جس نے مطلوب حاصل کر لیا ہو۔ جب داتا صاحب مطلوب کو پالنے کے بعد لاہور میں اقامت گزین ہو گئے تو انھوں نے عوام اور مسافروں سے حسن سلوک کا عہد کس طرح پورا کیا؟ اس کی ایک جھلک ”اقامت میں صحبت

کے آداب میں ملتی ہے، جہاں آپ مریدوں کو ہدایت کرتے ہیں،

”جب کوئی درویش سفر چھوڑ کر اقامت اختیار کر لے تو اس کے ادب کی شرط یہ ہے کہ جب کوئی مسافر اسکے پاس پہنچے تو اسکی عزت کرے، خندہ پیشانی سے پیش آئے اور کامل ادب و احترام سے اسے اپنا مہمان قبول کرے۔ تکلف کے بغیر جو کچھ موجود ہو حاضر کرے۔ یہ نہ پوچھے کہ کہاں سے آئے ہو یا کہاں جاؤ گے یا تمہارا نام کیا ہے۔ ان کے آنے کو خدا کی طرف سے، ان کے جانے کو خدا کی طرف سے اور ان کے نام کو خدا کا بندہ خیال کرے۔ پھر غور کرے کہ اس کو آرام کیلئے تنہائی چاہئے یا صحبت۔ اگر اس کو خلوت پسند ہے تو اسکے لئے جگہ خالی کر دے۔ اگر اس کو صحبت پسند ہے تو بے تکلف صحبت اور ہمدردی سے گفتگو کرے اور جب مسافر سونے کیلئے لیٹ جائے تو مقیم کو چاہیئے کہ اس کے پاؤں دابے۔ دوسرے دن اسے کسی صاف ستھرے حمام میں لے جائے، وہاں اسے اجنبی خدمت گزار کے حوالے نہ کرے بلکہ خود اس کی خدمت کرے اسکے بدن کو اپنے ہاتھوں سے ملے تاکہ وہ بدن کی صفائی کی طرح خود بھی تمام عیبوں سے پاک ہو جائے۔ مقدور ہو تو اسے نئے کپڑے بنوادے ورنہ اس کے پرانے کپڑوں کو بھی دھو ڈالے۔ تاکہ حمام سے نکل کر اسے پہن لے۔ حمام سے واپسی پر اسے تین دن اور بھڑائے۔ اگر اس شہر میں کوئی بزرگ یا کوئی جماعت یا اسلام کے اماموں میں سے

کوئی موجود ہو تو اسے دلوں چلنے کی دعوت دے۔ اگر انکار ہو تو مجبور نہ کرے کیونکہ طالبان حق پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اپنا دل بھی ان کے قابو میں نہیں ہوتا۔ یہ تو کسی حالت میں بھی روا نہیں کہ مسافر کو اپنی دنیا کو سلام کرنے یا دعوت یا عبادت کے لئے لے جائے۔ انھیں گدائی کا آلہ بنانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ سرے سے ان کی کوئی خدمت ہی نہ کی جائے۔ اس میں کیا شک ہے کہ داتا صاحب نے دوسروں کو جو نصیحت کی ہے خود اس پر کئی چند عمل کرتے ہوں گے اور اسی حسن سلوک اور غریب پروری کی انتہائی دلکش عادات کے باعث ”مخدوم“ اور ”گنج بخش“ کہلانے لگے ہوں گے۔

”گنج بخش“

سید علی ہجویریؒ پاکستان اور ہندوستان میں داتا صاحب یا گنج بخش کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اس لقب کے ضمن میں یہ روایت زبان زدِ خلایق ہے کہ جب خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان میں تشریف لائے تو لاہور پہنچ کر حضرت شیخ علی ہجویری کے مزار پر چلے گئے تاکہ اس کی تکمیل پر مزار کی پائنتی کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا

ناقصاں اپیر کامل کاملان رارہما

اس روز سے لقب گنج بخش مشہور ہوا۔ تحقیقاتِ چشتی کے بعد تذکرہ نویسوں نے

پہلا مصرعہ بدل دیا۔ اب اسے یوں پڑھا جاتا ہے :

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا

اس وقت مزار پر جو لوح نصب ہے اس پر بھی پہلا مصرعہ اسی طرح لکھا ہے۔

مولانا ہاشمی مرحوم لکھتے ہیں کہ :
 ”ادبی اعتبار سے یہ شعر اتنا ادبی، بلکہ نادرست نظر آتا ہے کہ
 ہم خواجہ بزرگؒ سے اسے منسوب کرنا ادب کے خلاف خیال کرتے
 ہیں۔“

داتا صاحب سے منسوب ایک رسالہ ”کشف الاسرار“ میں داتا صاحب کو اس
 لقب پر تاسف کا اظہار کرتے دکھایا گیا ہے :

”اے علی! خلقت تجھے گنج بخش کہتی ہے حالانکہ تیرے پاس ایک
 دانہ تک نہیں تو اس بات پر فخر نہ کر کیونکہ یہ غرور ہے گنج بخش
 اور رنج بخش صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو بے مثل ہے جس کی
 مانند کوئی دوسرا نہیں۔ جو شہر سے پاک ہے اور نمونے سے
 آزاد ہے۔ جب تک تو زندہ ہے شرک کے قریب نہ جاؤ۔
 اللہ تعالیٰ کو واحد اور لاشریک خیال کر۔“

اگر یہ رسالہ واقعی داتا صاحب کا لکھا ہوا ہے تو آپ اس لقب کو شرک سمجھتے تھے۔ اس
 شہادت سے قطع نظر قرائن سے یہی پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنی زندگی میں ہی اس لقب سے
 پکارے جانے لگے تھے۔



محمود کی تلوار یاد ویش کی زبان

حضرت داتا صاحب کے زمانہ میں اسلامی دنیا کے مشرقی حصہ میں اسلام کے فروغ کا سہرا محمود کے سر باندھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ شمالی ہند میں اسلام کی اشاعت اور اسلامی ثقافت کی بنیاد محمود غزنوی کی مرہون منت ہے۔ ایم۔ ناظم نے اس کے حق میں مفصل بحث کی ہے اور ان کا زمانہ کی بنا پر اسے ہندوستان میں اسلام کا پہلا ہیرو قرار دیا ہے۔

محمود غزنوی نے اسلام کی اشاعت کے لئے کیا کچھ کیا؟ اس پر بعد میں بحث کی جائے گی۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ محمود نے غزنی اور لاہور میں جس ثقافت کو فروغ دیا، کیا وہ واقعی اسلامی ثقافت تھی؟ اس زمانے میں ثقافت کا سرچشمہ دربار اور طبقہ امرام تھا۔ ان کی طرف سے شاعروں اور دوسرے فنکاروں کی سرپرستی ادب نوازی کے ذیل میں نہیں آتی۔ جدید اصطلاح کے مطابق شعروادب کو ابلاغ عامہ اور حکمرانوں کی پابستی کا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ "چہار مقالہ" کے مطابق اس سرپرستی کی وجہ سے امرام کو شہرت حاصل ہوتی تھی، اس طرح شاعر بھی سلاطین سے انعام و اکرام حاصل کر کے شہرت حاصل کرتے تھے۔

غدا نخواستہ غزنویوں کی کردار کشی مقصود نہیں — دکھانا صرف یہ چاہتا ہوں — کہ محمود مجاہد تو تھا، مبلغ اسلام نہ تھا، اس کی نجی زندگی اور درباری معاشرت اسلامی تعلیمات

سے کستور مطابقت رکھتی تھی؛ دربار کی مجالس نشاط و شرب میں شراب پیش کی جاتی تھی جسے سلطان اور درباری بے دریغ پیتے تھے۔ محمود کے دور میں ساقیوں کا سردار ایاز تھا۔ بیہوشی نے مسعود کے دربار میں ایک جشن (۴۲۹ھ / ۱۰۳۸ء) کا چشم دید حال قلمبند کیا ہے۔ وہ دربار کی آرائش و زیبائش کی تصویر کشی کے بعد لکھتا ہے:

”امیر مسعود لباس تبدیل کر کے آیا اور مرصع ایوان میں دسترخوان پر رونق اندوز ہوا، امراء اور معززین بھی دسترخوان پر بیٹھے۔ ایوان کے باہر بھی دسترخوان بچھلا دیے گئے جن پر فوجی افسر بیٹھ گئے۔ مطربوں نے ساز چھیڑے تو شراب پانی کی طرح بہنے لگی۔ جو لوگ مدہوش ہو گئے وہ دسترخوان سے اٹھ گئے۔ امیر مسعود بھی ستر سے سرشار اٹھے اور گھوڑے پر سوار ہو کر باغ میں پہنچے۔ جہاں پھر پہلے جیسی شاندار مجلس اُراستہ ہوئی۔ — مذہبوں کے آنے پر پھر شراب کا دور چلا۔ نماز مغرب تک بھی شراب پیتے رہے“

مسعود کی کثرت شراب نوشی کا کلام اس کے وزیر احمد بن عبد الصمد نے بھی کیا ہے۔ اسی طرح لاہور کے دربار میں امراء اور فنکار شراب پی کر جو فرمستیاں کرتے تھے، اسکا ذکر پانچویں باب میں آچکا ہے صاحب چہار مقالہ، محمود کے عجیب ذوق کا اشارہ کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کرتا ہے کہ محمود کو ایاز سے جو عشق تھا — سب جانتے ہیں۔ محمود شراب سے تجاوز کرنا نہ چاہتا تھا، مگر ایک روز بے قرار ہو کر ایاز کو آغوش میں لے لیا محبتوں نے کہا کہ محمود نے عشق میں فسق شامل کر دیا ہے۔ محمود نے ندامت میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں۔

شیخ شریف الدین عطارؒ اور مولانا رومیؒ محمود و ایاز کے تعلقات کو اور ہی نظر سے دیکھتے ہیں اور مسعود انہی دو بزرگوں کی سفارش اسے اس الزام سے بری قرار دے

سکتی ہے۔ تاہم یہ خرابی اس زمانہ کے طبقہ امرا میں بڑی عام تھی۔ مسعود اپنے تقریباً
 ہم عمر حجازی یوسف بن بکنگین سے سیاسی خطرہ محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے یوسف کی جنبی
 بے راہ روی کا سراغ لگانے کے لئے اس کے محبوب غلام زادے کو مخبری پر آمادہ
 کیا۔ یوسف کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر خود اس سے اپنی بے راہ روی کا اعتراف
 کرایا۔ محمود غزنوی کے سنی اور حنفی العقیدہ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اس نے قرآن کی
 تعلیم مشہور حنفی عالم قاضی ابونصر حسینی سے حاصل کی تھی۔ عتبی کا بیان ہے کہ سلطان
 محمود کو مختلف دینی امور پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ کوئی بدعت اس کی نظر سے بچ نہیں
 سکتی تھی۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دن دربار میں دینی امور زیر بحث تھے
 کہ ایک محدث سے بلا اجازت لب کشائی کا "گناہ" سرزد ہو گیا۔ محمود نے انہیں اس
 بے رحمی سے مارا کہ ساری عمر کے لئے سماعت سے محروم ہو گئے۔

مشہور حنفی فقیہ اور امام اظہار کے عزیز شاگرد قاضی ابویوسف نے "کتاب
 الخراج" میں مالگزاری کے جوہر اصول متعین کئے تھے۔ محمود اور اسکے جانشین ان
 پر پرائے نام بھی عمل نہ کرتے تھے۔ اس الزام سے ان کے پیش رو بھی بری نہیں ہیں۔
 لیکن غزنوی سلطان نے اپنے خزانے بھرنے کے لئے عوام پر ان کے مقدور سے زیادہ
 ٹیکس عائد کئے۔ ولی کے لئے جبر و تشدد کا کوئی حربہ بے استعمال نہ
 تھا۔ ۱۰۰۰ھ میں ملتان پر اس لئے قبضہ کیا کہ اس
 کا عالم اسماعیلی ہونا تھا۔ اس نے ملتان کو لوٹ مار سے بچانے کے لئے شہریوں سے دو
 کروڑ درہم، اور دوسری روایت کے مطابق بیس ہزار درہم وصول کئے۔ ظاہر ہے کہ
 یہ جرمانہ صرف اسماعیلیوں سے ہی وصول نہ کیا گیا ہوگا۔

✓ ہندوؤں کا اسلام سے نفرت

کیا شمالی ہند میں اسلام کی اشاعت محمود کا کارنامہ ہے؟ ہمارے تاریخی حقائق کو ملحوظ رکھیں

تو ہمیں پروفیسر حبیب کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ محمود کی پالیسی کے نتیجے میں —
 ہندوستان کے غیر مسلموں نے اسلام کی آواز سننے سے پہلے ہی اسلام کو مسترد کر دیا تھا۔
 محمودی تلوار کے ڈر سے اند پال کے بیٹے سکھ پال نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور
 محمود نے انعام میں اسے بھیسرہ کی حکومت عطا کر دی تھی، لیکن سلطان کے واپس پلٹنے
 ہی وہ اسلام سے منحرف ہو گیا، اور اس نے محمود کے تمام مسلمان افسروں کو نکال دیا۔ اس طرح
 اگر محمود کی تلوار کے ڈر سے کچھ اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے ہوں تو اسے اسلام کی اشاعت قرار
 نہیں دیا جاسکتا۔

ہندوؤں کے ذہنوں پر محمودی حملوں کا جو رد عمل ہوا وہ البیرونی کے مشاہدہ کے مطابق
 یہ تھا کہ :

"ہندو مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کو
 مسلمان کے نام سے ڈراتی ہیں — ہندو اپنے لئے اس سے بڑی ذلت
 کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ انھیں مسلمانوں کا لباس پہننے پر مجبور کیا
 جائے۔"

البیرونی اس کا سبب یہ بتاتا ہے کہ :

"محمود نے اس ملک کی خوشحالی کو مکمل طور پر برباد کر دیا ہے۔ محمود
 کی حیرت ناک مہموں کے نتیجے میں ہندو مٹی کے ذرات کی طرح ہر سو
 بکھر گئے ہیں اور ان کا ذکر لوگوں کی زبان پر قصہء پارینہ بن گیا ہے۔
 ان خاکسار ہندوؤں کے دل تمام مسلمانوں کے خلاف نفرت
 سے لبریز ہیں۔"

ہندوؤں کی یہ نفرت بے وجہ نہ تھی۔ محمود نے ۵۳۹۹ھ/۹-۱۰۰۸ء میں کانگراہ سے
 سات کروڑ درہم کے سکے اور ستر ہزار من (یہ من پاکستان کے ساڑھے بارہ سیر کے برابر تھا)

سونا چاندی غنیمت میں حاصل کی۔ اس سلسلہ میں سو منانہ کی مثال بھی پیش نظر ہے، کہ وہاں سے دو کروڑ دینار کا مال غنیمت حاصل ہوا تھا۔ باقی مہموں میں جو دولت ہاتھ لگی وہ غلطی ہے۔ سنہ ۱۰۱۸ء میں قنوج کی فتح سے منجملہ دیگر اموال کے قرین ہزار غلام ہاتھ آئے جو غزنی میں دو سے دس درہم تک میں بک گئے۔

تاہم اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ پاسور تھ کے نزدیک ہندوستان صدیوں سے کانوں سے نکلنے اور تجارت سے حاصل ہونے والے سونے کو مندروں میں دفن کر رہا تھا اس وجہ سے تجارت کا توازن برقرار نہ رہا تھا لیکن محمود کے حملوں سے صورت حال بدل گئی۔ صدیوں سے منجملہ سونے کے گردش میں آجانے سے صنعت و تجارت میں جان پیدا ہو گئی اور تجارت کا توازن جو ہمیشہ ہندوستان کے حق میں رہتا تھا اب متوازن ہو گیا۔

اسی طرح اس دور میں غلامی کلنک کا ٹیکازہ تھی۔ آل سیکٹنگین خود غلام تھے۔ محمود کی مستقل فوج صرف غلاموں پر مشتمل تھی۔ دربار اور حرم میں غلاموں کی بھرمار تھی محمود کا محبوب ایاز غلام ہی تھا۔ غرضیکہ غلامی کوئی ایسی چیز نہیں جس کے لئے محمود کو مطعون کیا جائے۔

✓ محمود کی ہندو نوازی

محمود غزنوی نے اگر ہندوؤں کو مسلمان بنانے کے لئے تلوار استعمال کی ہوتی تو ہمیں مفتوحہ علاقوں میں نہ سہی، دارالحکومت غزنی میں تو کوئی ہندو نہ ملتا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ غزنی میں محمود کے فیمل خانہ کا سارا عملہ ہندو تھا، اور ان کے انچارج کا رتبہ حاجب کے برابر تھا۔ حاجب بزرگ کے عہدے سے نیچے کے تمام عہدے ہندوؤں پر کھلے تھے۔

عربوں اور کردوں کی طرح ہندوؤں کا بھی ایک لشکر تھا جس کا سربراہ سپہ سالار ہندوان کہلاتا تھا۔ بعض معاملوں میں مسلمانوں سے زیادہ ان ہندوؤں پر اعتماد کیا جاتا تھا اور وہ بجا طور پر اس اعتماد کے لائق تھے۔ ۱۲۲۵ھ / ۱۸۰۳ء میں مجود کے ایشیائی جانشین محمد کو امیر ایاز اور ابو علی دایہ جیسے مسلمان امرا بھی چھوڑ گئے تو ہندوؤں نے محمد کا ساتھ دیا۔ ان کا سالار سندریاز کے تعاقب میں مارا گیا۔ اسی طرح ایک باغی ترک جرنیل ایسنگ تگین پکڑا گیا تو اسے بحفاظت غزنی پہنچانے کے لئے ہندوؤں کے ایک دستہ ہی کو لائق اعتماد خیال کیا گیا۔ ۱۲۲۵ھ / ۱۸۰۳ء میں لاہور کے سپہ سالار احمد نیال تگین نے علم بغاوت بلند کیا تو اس کی سرکوبی کے لئے لاہور ہی کے ایک ہندو ملک حجام کو غزنی سے اس شان و شوکت سے روانہ کیا کہ مسلمان امرا دم بخور رہ گئے۔ احمد کا سر کاٹ کر لائے پر سلطان مسعود نے خود اپنے ہاتھوں سے ملک کے گلے میں جواہرات کا طوق پہنایا اور اسے مستقلاً سالار ہندو ان کے منصب پر فائز کیا۔

ان واقعات سے بہت پہلے سلطان محمود غزنوی نے ۱۲۹۲ھ / ۱۲۰۳ء میں سیستان میں ایک بغاوت فرو کرنے کے لئے ہندوؤں کے لشکر کو بھیجا، جس نے زرنج میں مسلمانوں کا نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل عام کیا۔ حتیٰ کہ جامع مسجد میں پناہ گزین مسلمانوں اور گرجوں میں پناہ گزین عیسائیوں کو بھی نہ چھوڑا۔ مجود کے دور میں ہی غزنی میں ہندوؤں کا پورا محلہ آباد ہو گیا تھا۔ جہاں انھیں بہت پرستی کی عمل آزادی تھی۔ دار الحکومت میں ہندوستانی امور کے لئے ایک الگ شعبہ قائم ہو گیا تھا، جس میں ہندو ترجمانی اور دبیری کے عہدوں پر فائز کئے گئے۔

دانا صاحب کے عہد کے سکے

مجود اور اس کے جانشینوں کی اس رواداری کو جدید سیاسی اصطلاح میں سیکولرزم ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت وہ سکہ ہے جو لطیف کے بقول لاہور کے عجائب گھر

میں محفوظ ہیں۔ — میں اپنی پوری کوشش کے باوجود عجائب گھر کے موجودہ (۱۹۷۱ء) ناظم کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکا کہ ان سکوں کی تصویر لینے کی اجازت نہیں دیتے تو نہ سہی ان کی ایک جھلک تو دکھادیں۔ خدا کرے یہ بیش بہا خزانہ محفوظ ہو۔

خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا، اصل بات یہ ہے کہ لاہور میں مضروب ہونے والے سکوں پر دو زبانوں میں عبارت لکھی ہے: ایک طرف عربی میں اور دوسری طرف دیوناگری میں۔

”اوریکت ایکم محمد اوتار زیت محمود“

جس کا ترجمہ یہ ہے: ”کہ اللہ ایک ہے۔ محمد اس کا اوتار ہے اور محمود بادشاہ۔“ اس کے علاوہ سال ضرب رب بھی دیوناگری میں لکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ محمود سے لیکر سلطان ابراہیم تک کے سکوں پر دیوناگری عبارت کے ساتھ شیوجی کی سواری کے پیل ”نندی“ کی تصویر نقش ہے۔^{۱۸}

توسیع سلطنت یا اشاعت دین؟

سلطان محمد غزنوی کے ”وائی امیر المومنین“ — ”یمین الدولہ و امین الملت“ — ”نظام الدین“ — ”ناصر الحق“ اور کہف الدولہ والا سلام“ جیسے التاباات سے اس کی انتظامیہ کا سیکور کردار نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہئے۔ — بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسیرونی جیسے ففساد کی طرح اس زمانے کے بعض اہل اللہ بھی محمود غزنوی کے غزوات کو کشور کشائی سے زیادہ رتبہ دینے کو تیار نہ تھے۔

حضرت داتا صاحبؒ نے کشف المحجوب میں صوفیائے متاخرین کے اماموں میں غزاسا کے حضرت ابونحسن علی بن احمد خرقانیؒ کے حالات قلمبند کئے ہیں۔^{۱۸} مؤرخ فرشتہ نے تاریخ بنائے گیتی کے حوالہ سے حضرت خرقانیؒ سے سلطان محمود کی ملاقات کا حال لکھا ہے، کہ محمود خاص ان کی زیارت کے لئے خرقان گیا۔ اسے احساس تھا کہ یہ درویش بادشاہ کو خاطر میں نہیں لائے گا، لہذا جس قاصد کو بلانے بھیجا اسے تاکید کر دی کہ اگر حضرت خرقانی میرے

یہاں آنے سے انکار کریں تو یہ آیت سننا کہ :

”اے ایمان والو! اطاعت کرو خدا کی رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم پر حاکم ہوں“

حضرت خرقانیؒ نے توقع کے مطابق محمود کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ قاصد نے وہ آیت پڑھی تو فرمایا :

”محمود کو جا کر کہہ دینا کہ میں اب تک اللہ کی اطاعت میں اس قدر مستغرق ہوں کہ اطاعتِ رسولؐ کے مرتبہ تک نہ پہنچ سکنے کی بڑی ندامت ہے۔ بھلا اس حالت میں حاکم کی اطاعت پر کیسے توجہ دے سکتا ہوں“

محمود یہ شکر خود ان کی خدمت میں پہنچا، مگر اس طرح کہ بغرض امتحان ایاز کو اپنا لباس پہنا کر بادشاہ بنادیا اور خود ایاز کے کپڑے پہن کر غلام بن گیا۔ حضرت خرقانیؒ نے محمود کو پہچان لیا اور باتوں ہی باتوں میں اس پر واضح کر دیا کہ ان کے نزدیک محمود اور ایک عام مسلمان میں کوئی فرق نہیں۔ محمود نے ہدیہ پیش کیا تو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ محمود نے تبرک مانگا تو اپنی گدڑی عطا فرمائی۔

فرشتہ لکھتا ہے کہ : سو مناجات کے معرکے میں جب سلطان محمود کو اپنی شکست یقینی دکھائی دی تو بارگاہِ الہی میں سجدہ ریز ہوا، اور حضرت خرقانیؒ کی گدڑی کو ہاتھ میں لے کر فتح کی دُعا مانگی جو قبول ہوئی۔ اسی رات شیخ خرقانیؒ خواب میں آئے اور محمود سے کہا :

”اے محمود! تو نے میری گدڑی کی ابرو لوٹ لی ہے۔ اگر تو محض اپنی فتح کی دُعا مانگنے کے بجائے سارے غیر مسلموں کے قبولِ اسلام کی دُعا مانگتا تو وہ بھی قبول ہو جاتی“

محمود کے جہاد پر شبہ

مؤرخ ابو الفضل بیہقی (المتوفی ۵۴۰ھ/۱۱۰۷ء) نے ایک ذاتی تجربہ بیان کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اہل اللہ کو محمودی غزوات کے مطابق شریعت ہونے پر بھی شک تھا۔ بیہقی لکھتا ہے کہ سلطان مسعود کو خبر ملی کہ بست کے قاضی ابوالحسن کا ہاتھ بڑا تنگ ہے اور وہ کسی کی مدد بھی قبول نہیں کرتے۔ ایک دن سلطان نے بیہقی کو طلب کر کے سونے کی ایک ایک ہزار ڈالیوں کی دو تھیلیاں دیں۔ ان میں سے ہر ڈالی کا وزن ایک مثقال (ساڑھے پانچ ماشے تقریباً) بیرونی۔ الہند جلد اول ص ۲۱۶) تھا۔ سلطان نے کہا یہ تھیلیاں ابونصر (وزیر) کے پاس لیجاؤ، کہ ان میں سے ایک قاضی ابوالحسن کو اور دوسری ان کے فرزند کو دے دے۔ ابونصر سے کہنا کہ یہ وہ سونا ہے جو میرے والد نے ہندوستان میں اپنے غزوات کے دوران کفار کے بتوں کو توڑ کر حاصل کیا تھا، لہذا اس کے عین حلال چھنے میں کوئی کلام نہیں۔ ابونصر مشکان نے سلطان کی فراخ دلی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے قاضی ابوالحسن اور ان کے بیٹے کو طلب کیا، اور سلطان کا عطیہ پیش کیا۔ لیکن قاضی صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ :

”میں یہ نہیں کہتا کہ ضرورت مند نہیں ہوں مگر اپنے حال پر قانع ہوں روزِ محشر قریب ہے اور میں اس سونے کا حساب نہیں دے سکوں گا۔ لہذا میں پاسِ ادب سے انہیں قبول کر کے واپس کرتا ہوں۔“

ابونصر مشکان نے کہا :

”سبحان اللہ! یہ سونا سلطان محمود نے بزورِ شمشیر کفار کے بتوں کو توڑ کر حاصل کیا ہے اور امیر المومنین (خلیفہ بغداد) نے بھی سلطان محمود کے جہاد کی توثیق کی ہے لیکن آپ میں کہ لے قبول کرنے سے

انکار کر رہے ہیں !

قاضی صاحب نے جواب دیا :

” اللہ سلطان کی عمر دراز کرے، اصل بات یہ ہے کہ امیر المومنین کا حال میرے حال سے مختلف ہے۔ وہ مالک ملک ہے۔ علاوہ انہیں آپ (وزیر ابونصر)، امیر محمود کے ہمکاب رہے ہیں میں نہیں رہا مجھے کیا پتہ کہ یہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق انجام دی گئی تھیں کہ نہیں۔ میں کسی حالت میں بھی یہ سونا اور اسکی ذمہ داری قبول نہیں کروں گا۔“

پہلے داتا صاحب کا رویہ بھی کم و بیش یہی تھا۔ آپ کے زمانہ میں محمود اور اس کے جانشینوں کے ”غزوات“ کا بڑا شہرہ تھا، لیکن داتا صاحب ان سے ذرا بھی متاثر دکھائی نہیں دیتے۔ کشف المحجوب میں اسلامی عقائد کے تمام مبادیات مثلاً ایمان — توحید — رسالت — حج — روزہ — نماز اور زکوٰۃ پر سید حاصل روشنی ڈالی ہے لیکن جہاد کا کہیں ذکر نہیں فرمایا۔ اگر کیا ہے تو نفس کے خلاف جہاد کا — لکھتے ہیں :

” رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے : مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کے لئے اپنے نفس سے جہاد کیا۔ نیز آنحضرتؐ نے فرمایا : ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹے، عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ جہادِ اکبر کیا ہے ؟ تو حضورؐ نے فرمایا : ”سُنُوا وہ مجاہدہ نفس ہے“۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدہ نفس کو جہادِ پر اس لئے فضیلت دی ہے کہ اس میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جہادِ خواہش نفس کو مٹانے کے مترادف ہے اور مجاہدہ نفس کو مغلوب کرنے کے۔“

اگر ایک لحظے کے لئے فرض کر لیا جائے کہ سلطان محمود کے غزوات کا مقصد انشا ءِ اللہ
 دین تقاتب بھی داتا صاحب اس کے طریق کار اور نسبتاً بیچ سے مطمئن دکھائی نہیں
 دیتے۔ اسکا اظہار 'باب المحبتہ وما تعلق بہا' کی ایک عبارت سے ہوتا ہے
 آپ نے محبت کے بارے میں بعض بزرگوں کے اقوال بیان کر تے ہوئے ایک قول
 یہ نقل کیا ہے کہ :

"ہندوؤں میں محمود کا غلام بننے کے مقابلہ میں محبت کا غلام بننے
 کی رغبت زیادہ نظر آتی ہے"۔

امرواقعہ بھی یہی ہے کہ محمود نے ہندوؤں کا ملک اور ان کے جسم تو بے شک فتح کر
 لئے تھے مگر وہ دلوں اور ذہنوں کی تسخیر میں ناکام رہا۔ یہ فریضہ حضرت داتا صاحب نے انجام
 دیا اور اس خوبی کے ساتھ کہ آج ایک ہزار سال بعد لوگ محمود غزنوی کا نام تو قبول گئے ہیں
 لیکن داتا صاحب کا نام لاکھوں زبانوں پر جاری ہے۔



کشف المحجوب

حضرت داتا صاحب کی کشف المحجوب تصوف کے موضوع پر فارسی کی سب سے پرانی تصنیف ہے۔ جب تک اس سے پرانی کتاب دستیاب نہیں ہوتی، تب تک اس کتاب کا دعوئے اولیت برقرار رہے گا۔

اسلام میں تصوف کا تصور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ مبارک میں ہی قائم ہو گیا تھا۔ تاہم اس اصطلاح کا استعمال دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا اور اس فن کے مختلف پہلوؤں پر تصنیفات کا سلسلہ بھی اسی زمانہ میں جاری ہو گیا تھا۔ اس میں بعض ایسے عقائد اور مسائل بھی شامل ہو گئے تھے جن کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ چوتھی صدی ہجری کی پہلی دہائی (ذیقعد ۳۹۹ھ / مارچ ۹۲۲ء) میں حسین بن منصور علاج کے قتل نے صوفیوں کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ چنانچہ یہ امر ثابت کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ اصل تصوف کیا ہے اور یہ کہ طریقت اور شریعت کا باہمی تعلق کیا ہے ؟

اس مقصد کیلئے تصوف کے موضوع پر جماع تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تذکرہ نویس بتاتے ہیں کہ اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف شیخ ابوبکر محمد بن ابراہیم بخاری کلابازی (المتوفی ۴۸۰ھ / ۹۷-۹۹۰ء) کی "العرف فی مذہب التصوف" تھی۔ عین اسی زمانہ میں شیخ ابوالنعمان راج (المتوفی ۴۸۸ھ / ۷۹۸۸ء) نے اپنی شہرہ آفاق "کتاب الصبح فی التصوف" تالیف کی۔ ان دونوں میں سے کونسی

کتاب پہلے لکھی گئی؟ اسکا فیصلہ محال ہے۔ ہمارے داتا صاحب نے کشف المحجوب میں شیخ ابو نصر سراج کا ذکر کیا ہے اور ان کی "کتاب الجمع" سے ایک عبارت نقل کی ہے (صفحہ ۳۰۴ اور ۳۸۱) ہمارے مطلب کی بات صرف اتنی ہے کہ تصوف کے موضوع پر یہ دونوں کتابیں عربی میں لکھی گئی تھیں۔

"کشف المحجوب" کی فارسی میں اولیت کو شیخ ابو بکر کلا بازی کی "التعرف" کی "شرح تعرف" کی بنیاد پر چیلنج کیا گیا ہے۔ مولوی شفیق مرحوم نے لکھا ہے کہ

"تصوف پر پہلی فارسی کتاب جو ہم تک پہنچی ہے وہ ابو ابراہیم اسماعیل مستملی بخاری متوفی ۴۳۴ھ (۱۰۴۲-۱۱۰۶ء) کی کتاب "شرح تعرف" ہے جو دیوبند میں چھپی مگر پشاور یونیورسٹی کے نسخے سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند والے نسخے میں کتاب کی پرانی زبان کو بدل دیا گیا ہے۔ "شرح تعرف" کے بعد "کشف المحجوب" ہے جو فارسی میں تصوف کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے۔"

علماء اس خیال کو لے اڑے۔ آقا ثناء اللہ علیہ السلام نے اس موضوع پر اپنے مقالہ "یکے از قدیمترین نسخ زبان پارسی اواخر دورہ سامانی" میں "شرح تعرف" اور اس کے مختلف نسخوں پر بحث و تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ پشاور یونیورسٹی والا قلمی نسخہ سب سے پہلا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اب تک علی ہجویری کی کشف المحجوب" فارسی زبان میں تصوف کی اول ترین اور قدیم ترین کتاب شمار ہوتی ہے۔ چونکہ ہجویری کا سال وفات ۵۴۶ھ ہے، اس وجہ سے مستملی کی یہ شرح تعرف کشف المحجوب سے تقریباً اسی سال قدیم تر ہے۔ یہ دور غزنوی کی تالیف ہے اور وہ عہد سامانی کی"

مولانا ہاشمی مرحوم نے بھی یہ رائے قبول کر لی اور یہ معذرت پیش کرنا ضروری خیال

کیا کہ : "کشف المحجوب" کی فضیلت فی الواقع محض اس کی قدامت پر

قائم نہیں بلکہ اسکے گونا گوں اوصاف معنوی پر مبنی ہے^۳۔

ان علماء نے کشف المحجوب کی قدامت کا فیصلہ کرتے وقت اس نکتے کو ملحوظ

نہیں رکھا کہ مستملی کی کتاب "شرح" ہے اور ذاتا صاحب کی کتاب "طبعزاد" ہے۔

ترجمہ، شرح اور طبعزاد میں جو فرق ہے اسے ملحوظ رکھا جائے تو کشف المحجوب کی

اولیت برقرار رہتی ہے

قدیم ترین نسخہ

"کشف المحجوب" پر عہد میں مطلوب و مقبول رہی ہے۔ مولوی محمد شفیع مرحوم

کے ذاتی کتب خانہ میں "کشف المحجوب" کی قدیم ترین نقل موجود ہے جسے ان کے فرزند احمد

ربانی نے شائع کر دیا ہے۔ اس نسخے کی قدامت سے قطع نظر خوبی یہ ہے کہ اسے حضرت

نہار الدین زکریا ملتانی جیسے ولی اللہ نے ۹۶۴ھ / ۱۶۶۵ء میں اپنے قلم سے نقل

کیا تھا۔

کشف المحجوب کو خراج تحسین

کشف المحجوب کو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ دامت برکاتہم و آلہم و سلم ۷۲۵ھ /

۱۳۲۵ء نے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ :

"کشف المحجوب شیخ علی ہجویریؒ کی تصنیف ہے۔ اگر کسی کا مرشد

نہ ہو تو اس کتاب کے مطالعہ کی برکت سے مل جائے گا۔ میں

نے اس کتاب کا بہ تمام مطالعہ کیا ہے۔

اسی عہد کا ایک مؤرخ ضیاء الدین برنی "تاریخ فیروز شاہی" میں ۷۵۸ھ / ۱۳۵۷ء کے نواح میں لکھتا ہے کہ :

"عہد علانی کے آخری چند سالوں میں لوگوں کی حالت اس قدر بدل گئی تھی کہ کبیرہ گناہ بمنزلہ کفر ہو گئے تھے۔ اشراف و اکابر سلوک کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ قوت القلوب - احیاء العلوم - احیاء العلوم کا ترجمہ عوارث - کشف المحجوب، شرح تعرف وغیرہ کے بہت زیادہ خریدار پیدا ہو گئے تھے۔"

حضرت شرف الدین احمد میری "المتوفی ۷۸۲ھ / ۱۳۸۱ء" نے اپنے مکتوبات میں جابجا کشف المحجوب کا ذکر کیا ہے اور حضرت جہانگیر شرف سمنانی "المتوفی ۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ء" کے مخطوطات "لطائف اشرفی" میں بھی اس کتاب کے حوالے بکثرت موجود ہیں۔
ملا نور الدین جامی نے ۸۸۳ھ / ۱۴۷۸ء میں "نفحات الانس" مکمل کی جو دراصل ہمارے داماد صاحب کے ایک معاصر خواجہ عبداللہ انصاری ہروی "المتوفی ۹۱۸ھ / ۱۵۱۰ء" کی تالیف "طبقات صوفیہ" پر مبنی ہے مگر جامی نے اس میں بزرگان مابعد کے تراجم بھی شامل کر دیئے۔ اس میں داماد صاحب کا تعارف "کشف المحجوب" کے حوالہ سے کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اس فن کی مشہور اور معتبر کتابوں میں ہے اس لئے کہ بہت سے لطائف اور حقائق اس کتاب میں جمع کئے ہیں۔

شہزادہ داراشکوہ نے ۱۰۴۹ھ / ۱۶۳۹ء میں "سفینۃ الاولیاء" بمبلی کی تھی اس میں وہ کشف المحجوب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے :
"کسی کو اس کتاب کی خوبیوں میں کلام نہیں۔ یہ درحقیقت کامل رہنما ہے اور کتب تصوف میں ایک مرشد کامل ہے۔"

فارسی میں ایسی کامل تصنیف کوئی نہیں۔

لاہور کا اعزاز

لاہور کو یہ فخر حاصل ہے کہ ایسی بلند پایہ اور بزرگ کتاب اس کی سر زمین پر لکھی گئی۔ دانا صاحب ایک دنیا کا سفر کرنے کے بعد لاہور میں مقیم ہوئے تھے۔ یہاں اقامت سے صوفی کی وہ حالت مراد ہے جسے سفروں کی تکمیل کے بعد اختیار کرتا ہے۔ لکھتے ہیں :

”سب درویش دو قسم کے ہوتے ہیں : ایک مقیم دوسرے مسافر۔ مشائخ کا طریق یہ ہے کہ مسافر مقیموں کو اپنے اوپر ترجیح دیں، اس لئے کہ مسافر اپنے نصیب کے واسطے جا رہے ہیں اور مقیم حق کی خدمت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسافری میں طلب اور تلاش پائی جاتی ہے اور مقیموں میں مطلوب کے حاصل ہو جانے کی نشانی — پس فضیلت اس کو حاصل ہوگی جس نے مطلوب کو پالیا اور پیٹ گیا۔“

اگرچہ یہ کوئی شرط نہیں کہ مقیم اقامت ترک نہیں کر سکتا مگر قرآن بتاتے ہیں کہ دانا صاحب ایک دنیا کی سیاحت کے بعد پنجاب تشریف لائے اور یہاں کے مختلف علاقوں کو دیکھنے کے بعد لاہور میں مقیم ہو گئے اور دم واپس تک یہیں رہے اسی باب میں آگے چل کر اپنے ایک عہد کا اعلان کیا ہے :

”مجھ علی بن عثمان جلابی کو اپنے سفروں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بات ناگوار اور رنج دینے والی نہ تھی کہ جاہل خادم — اور بے خوف مقیم کبھی مجھ کو اپنے ساتھ لے لیتے۔ کبھی اس خواجہ

کے گھر پہنچاتے کبھی اس دہقان کے گھر میں دلی کراہت کے ساتھ
چلا جاتا اور بظاہر درگزر کرتا۔ پھر مقیم لوگ مجھ سے جو بے قاعد گیا
کرتے تھے میں ان کی وجہ سے دل میں عہد کر لیتا، کہ اگر میں کسی
وقت مقیم ہو جاؤں گا تو مسافروں سے کبھی ایسا سلوک روا نہ
رکھوں گا۔“

داتا صاحب نے لاہور میں اقامت، اختیار کرنے کے بعد دعوت وارشاد کی جو مسند
بچائی۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں افراد نے اسلام قبول کیا۔ دارا شکوہ نے لاہور
میں مسجد تعمیر کرنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی مستقل اقامت کا ثبوت فراہم کرتی ہے
کشف المحجوب کی تصنیف اسی دور میں مکمل ہوئی ہوگی۔
کشف المحجوب کے لاہور میں لکھے جانے کی واضح شہادت بھی بعض نسخوں سے
ملتی ہے۔ آپ ایک جگہ لکھتے ہیں :

”اس وقت زیادہ لکھنا ممکن نہیں کیونکہ میری کتابیں غزنی میں رہ گئی
ہیں اور میں یہاں دیار ہند کے شہر لاہور میں جو طمان کے مضافات
میں ہے نا جنسوں کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔“

نکلسن نے کشف المحجوب کے انگریزی ترجمہ کے پیش لفظ میں ان سطور کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے لکھا :

”کشف المحجوب کا تعلق مصنف کی عمر کے آخری برسوں سے ہے
کم از کم اس کے ایک جزو کا تعلق تو لاہور میں قیام کے دنوں
سے ہے۔“

نکلسن کے جملے کی ساخت یہ بتاتی ہے کہ اس نے جزو کا ذکر ازراہ احتیاط کیا ہے۔
لیکن اس کی یہ احتیاط بعض علما کے لئے شرط بن گئی۔ مثلاً مولوی محمد شفیع مرحوم نے

کشف المحجوب کے مقدمہ اور اپنی نشری تقاریر میں یہ بات کئی بار دہرائی ہے کہ کتاب کا ایک حصہ لاہور میں لکھا گیا تھا۔ اس تکرار سے یہ تاثر ملتا ہے کہ گویا باقی حصہ لاہور میں نہیں لکھا گیا۔ غالباً اسی سے متاثر ہو کر محترم عبدالمجید بزدانی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ داتا صاحب "کتاب کی تالیف کے وقت اکثر دبیشتر ہجویر میں قیام پذیر رہے" ۱۶

یادداشت کا کمال

داتا صاحب کے اس بیان سے کہ "کتاب میں غزنی میں رہ گئی ہیں" — یہ مترشح ہوتا ہے کہ کشف المحجوب حوالے کی کتابوں کے بغیر محض اپنی یادداشت سے لکھی گئی ہے، اور یہ بچلے خود ایک کارنامہ ہے — تاہم مولوی محمد شفیع مرحوم لکھتے ہیں :

"اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تحریر کتاب کے وقت ،

داتا صاحب کے پاس کوئی تحریری مواد مراجعت کے لئے موجود نہ

تھا۔ درجنوں آیات شریفہ ۱۳۷ احادیث اور ۵۷ عربی اشعار جو

اس کتاب میں آئے ہیں — ان کا زبانی لکھ لینا تو چنداں دشوار

نہ تھا مگر تقریباً تین سو اقوال مشائخ اور بیس اکیس کتبوں کی

عبارتیں جو بقیہ مصنف کتاب میں درج ہیں — ان کا حلفے سے

درج کرنا قرین قیاس نہیں" ۱۷

کشف المحجوب کے مطالعہ سے ہم مولوی شفیع کے قول پر خود داتا صاحب کے قول

کو ترجیح دینے پر مجبور ہیں۔ داتا صاحب نے اپنے حافظہ سے جو کچھ لکھا ہے وہ آج کے زمانے

میں حیران کن لگتا ہے مگر اس زمانے میں یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ داتا صاحب نے خود

کشف المحجوب میں حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر الخالدی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ علم تصوف

کے فنون میں بہت بڑے فاضل اور مشائخ کے کلام کے حافظ تھے۔ ۱۸

اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ داتا صاحب کے زمانہ حیات میں امام محمد بن محمد الغزالیؒ نے جرجان میں امام ابو نصر کے درس میں جو نوٹس لئے تھے، واپسی میں ڈاکوؤں نے دوسرے سامان کے ساتھ لوٹ لئے تھے۔ امام غزالیؒ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور کہا کہ میں اپنے اسباب اور سامان میں سے صرف اس مجموعہ کو مانگتا ہوں کیونکہ میں نے یہ سفر انہی کے لئے کیا ہے وہ ہنس پڑا، اور کہا: — ”تم نے خاک سیکھا کہ ایک کاغذ نہ رہا تو کوئے رو گئے“۔ یہ کہہ کر اس نے کاغذات واپس کر دیئے۔ امام غزالیؒ پر اس طعنہ آمیز فقرے نے ہلقت عینبی کی آواز کا اثر کیا۔ چنانچہ وطن پہنچ کر وہ یادداشتیں زبانی یاد کرنی شروع کیں، یہاں تک کہ تین سال میں ان مسائل کے حافظ بن گئے۔^{۱۵}

کشف المحجوب میں داتا صاحب نے مشائخ اور ان کی تصانیف کے حوالے دینے کا جو التزام کیا ہے اسکے پیش نظر مولوی شفیع صاحب کو گمان گزرا کہ ساری کتاب کسی نہ کسی قسم کی ”ریفرنس بک“ کے بغیر نہ لکھی گئی ہوگی لیکن انھوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی کہ کشف المحجوب میں کم از کم پچاس مقامات پر داتا صاحب کو مشائخ کے نام یا ان کے حوالے یاد نہ رہے چنانچہ انھیں ”میں نے کسی بزرگ سے سنا ہے“ — ”ایک شیخ کا قول ہے“ اور — ”مجھے عبارت تو بعینہ یاد نہیں، مگر اس کا مطلب یہ ہے“ — جیسے جملوں کا سہارا لینا پڑا ہے۔ یہ سلسلہ پوری کتاب میں پھیلا ہوا ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ کتاب واقعی حافظہ کی مدد سے لکھی گئی تھی۔ ان میں ایک یہ حوالہ ہے کہ :

”ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس سال سفر کیا میری کوئی

نماز جماعت کے بغیر نہ ہوتی تھی اور ہر جمعہ کے روز میں ایک

قصہ میں ہوتا تھا۔“^{۱۶}

سید صباوح الرحمن عبدالرحمن لکھتے ہیں کہ — ”خاکسار کا خیال ہے کہ حضرت شیخ ہجویریؒ

نے ان سطور میں خود اپنی طرف اشارہ کیا ہے۔“^{۱۷}

ترتیب و تسلسل

بعض علماء نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ کشف المحجوب تسلسل و متواتر لکھی جاتی رہی۔ یا مختلف اوقات میں اس کے مختلف اجزاء قلمبند ہوتے رہے۔ مولانا ہاشمی نے لکھا ہے کہ ”کشف المحجوب کو حقیقت میں چند مستقل اجزاء کا مجموعہ سمجھنا درست ہوگا۔ یہ اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ کتاب مختلف اوقات میں قلمبند کی گئی تھی“

ان دونوں خیالات کی تصدیق کم از کم کشف المحجوب سے تو نہیں ہوتی کیونکہ داتا صاحب نے کتاب کے شروع میں حمد و ثناء کے بعد ہی اعلان کر دیا ہے کہ میں نے کشف المحجوب لکھنے کے لئے استخارہ کیا ہے اور موضوع زیر بحث کئی ابواب میں منقسم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اس خیال کی وضاحت کرنے کے بعد پہلے باب کی تہید میں لکھتے ہیں :

”اب میں کتاب کو شروع کرتا ہوں اور تمہارا مقصود مخفی مقامات اور پردوں میں سے نکال کر ظاہر کرتا ہوں اور اسے لطیف بیان سے واضح کر دیتا ہوں اور اہل صناعات کی عبارات کی تشریح کے ساتھ ساتھ مشائخ و موفیہ کے کلام کا تھوڑا سا حصہ بھی اس کے ساتھ ملا کر بیان کروں گا اور عمدہ اور دلپذیر حکایات سے اسکی تائید بھی کروں گا۔ تاکہ تمہارا مقصود حاصل ہو جائے۔ علمائے ظواہر میں سے جو شخص اس کتاب میں غور کرے گا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ علم تصوف کی اصل قوی ہے اور اسکی شاخ باراد“

ہے۔“

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ کتاب کا موضوع اور ترتیب کتاب شروع کرنے

سے پہلے ہی مصنف کے ذہن میں موجود تھی۔ اس کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

”اب میں اس گردِ صوفیا کے اصول و رموز اور تصوف کے بابے میں بعض اشارات کی وضاحت کرتا ہوں۔ پھر ان مردانِ خدا کے نام اور مشائخِ صوفیاء کے مذاہب کا اختلاف اور اس کے بعد حقائقِ تصوف اور معارفِ الہیہ اور معاملاتِ شرعیہ اور اس کے بعد حتمی الامکان ان کے مقامات کے رموز و اکواب بیان کروں گا تاکہ تم پر اور دوسرے پڑھنے والوں پر طریقِ تصوف کی حقیقت منکشف ہو جائے۔“

۱) داتا صاحب نے اپنی کتاب میں ترتیبِ تسلسل اور تقدیم و تاخیر کا بڑا خیال رکھا ہے۔ مثلاً حضرت معروف کرخی کا بیان اس جگہ نہیں کیا، جہاں کہ کرنا چاہیے تھا۔ لہذا اس کا عذر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”ترتیب کے لحاظ سے ان کا ذکر مقدم ہونا چاہیے تھا لیکن میں نے دو پہلے بزرگ مؤلفین شیخ ابوبکر الرحمن سلمیٰ اور استاد امام ابوالعباس قشیریؒ کی موافقت کی ہے۔“ ۱

کشف المحجوب کیوں لکھی؟

داتا صاحب نے ”کشف المحجوب“ اپنے ایک ہم وطن ابوسعید ہجویریؒ کے سوال کے جواب میں لکھی ہے۔ ان کا سوال یہ تھا کہ :

”اے میرے لئے طریقت و تصوف کی حقیقت — اہل تصوف کے مقامات، ان کے مذاہب و اقوال اور رموز و اشارات — اللہ کی محبت اور دلوں پر اس کے ظاہر ہونے کی کیفیت۔ اس کی

ماہریت کی دریافت سے انسانی عقول کے حجاب کا سبب
اس کی حقیقت سے نفسِ امارہ کی فطرت اور بوگزیدگی اور
پاکیزگی سے رُوح کا آرام اور دوسرے جو امور اس سے متعلق
ہیں بیان کیجئے۔^{۲۳}

ہمارے زمانہ کے تذکرہ نویس حضرت ابوسعید ہجویریؒ کے حالات کا سراغ لگانے میں
ناکام ہو گئے ہیں۔ ایک صدی پہلے کے ایک تذکرہ سے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے — کہ
داتا صاحب کے مزار کے پاس دو قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک شیخ احمد حمادی سرخسی (د) کی
اور دوسری شیخ ابوسعید ہجویری کی ہے۔ — انہی شیخ ابوسعید کے سوال کے جواب میں داتا
صاحب نے کشف المحجوب لکھی تھی۔

کشف المحجوب کا نام

داتا صاحبؒ نے اپنی کتاب کا نام "کشف المحجوب" تجویز کرنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ
"اصحاب بصیرت کتاب کے نام سے ہی اس کے مضامین و مطالب
سے آگاہ ہو جائیں۔ یہ امر بھی واضح رہے کہ اولیاء اللہ اور عزیزان
درگاہ الہی کے سوا سارا عالم تحقیق کی رمز سے بالکل پردے میں ہے
چونکہ یہ کتاب راہ حق بیان کرنے اور امر حق کی شرح کرنے اور
بشریت کے پردے کھولنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ — اس لئے
کشف المحجوب کے سوا کوئی دوسرا نام مناسب نہ تھا۔"^{۲۵}

حال ہی میں ایرانیوں نے اس نام کا ایک قدیم مخطوطہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ ابویعقوب اسحاق بن
احمد گزی کی تالیف "کشف المحجوب" ہے جو اسماعیلیہ عقائد پر لکھی گئی تھی۔ ابویعقوب چوتھے
صدی ہجری میں ماوراء النہر کے اسمعیلی داعیوں میں سے ایک تھا، اور بقول آقائے سحر

نفسی اسے ۲۳۱ھ/۳-۹۴۲ء میں اسماعیلی ہونے کے جرم میں بخارا میں قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ کتاب تہران سے چھپ گئی ہے۔^{۲۶}

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ داتا صاحب کو اس کتاب کا قطعاً علم نہ تھا۔ ورنہ وہ اپنی تصنیف کو یہ نام کبھی نہ دیتے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ داتا صاحب کے نزدیک یہ فرقہ زندیق اور ملحد ہے مثلاً فرماتے ہیں :

”محدین روح کو قدیم کہتے اور اس کی پرستش کرتے ہیں اور روح

کو ایک جسم سے دوسرے کی طرف پلٹ جانے والا خیال کرتے ہیں

شیعوں، قرامطیوں اور باطنی لوگوں کا بھی اجماع اسی پر ہے۔“^{۲۷}

پھر لکھتے ہیں :

محدین کا گروہ شریعت اور حقیقت کا ایک دوسرے کے بغیر

قائم رہنا روا رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ جب حقیقت کا حال ظاہر

ہو گیا تو شریعت اٹھ گئی۔ یہ کلام بعینہ مشہین۔ قرامطہ شیعہ

اور سوسہ ڈالنے والوں کا ہے۔“^{۲۸}

ایک اور جگہ لکھا ہے :

”آج کل کے مصری شیعہ کو مجوسیوں کا بچا کھچا سمجھتے۔ یہ وہی کچہ کہ

ربے ہیں جو مجوسی کہا کرتے تھے اور یہ زندیق کا اسم ان کیلئے

خاص ہو گیا ہے۔“^{۲۹}

(۲۲) داتا صاحب کی کتابوں کا سرقہ

داتا صاحب نے کشف المحجوب میں ایک انوکھا اسلوب اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے

کہ جہاں اپنا ذکر آتا ہے یا کوئی ذاتی رائے پیش کرتے ہیں تو اپنا نام ضرور لکھتے ہیں۔ اسکی

وجہ یہ بتائی ہے کہ :

”اس علم سے جاہل لوگ جب کوئی ایسی کتاب دیکھتے ہیں جس میں مصنف کا نام کئی جگہوں پر لکھا ہوا نہ ہو تو اس کی تصنیف اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ مجھے یہ حادثہ دو مرتبہ پیش آیا ہے ایک دفعہ ایک شخص مجھ سے میرا دیوان شعر مانگ کر لے گیا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی نقل نہ تھی۔ اس نے سرورق سے میرا نام اڑا دیا، اور یوں میری محنت پر پانی پھیر دیا۔ اللہ اسے معاف کرے میں نے طریق تصوف میں ایک کتاب تالیف کی۔ اس کا نام ”منہاج الدین“ رکھا مگر ایک رکیک مدعی نے کہ جس کا نام کہنے کے لائق نہیں۔ اس کتاب پر سے میرا نام اڑا دیا اور عوام کے سامنے یوں ظاہر کیا جیسے وہ کتاب خود اس نے لکھی ہو۔ اہل لوگ اس بات پر ہنستے تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس کا نام

طالبان درگاہ الہی کے دیوان سے کاٹ دیا۔“ (۲۷)

داتا صاحب کے زمانہ میں شغل تصنیف و تالیف اختیار کرنے کے دو اسباب تھے : ایک سبب امرار، سلطان سے انعام کی امید تھی اور دوسرے سبب میں کوئی مالی مفاد شامل نہ تھا۔ پہلا طریقہ شعرار و ادبا کا تھا، اور دوسرا طریقہ صوفیا کا۔ داتا صاحب نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ :

”کتاب کی تصنیف و تالیف کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ

اس کا نام زندہ رہے اور متعلم اس کے حق میں دعائے خیر کرتے

رہیں۔“

اور پھر جگہ جگہ اپنا نام لکھنے کے اسباب میں ایک سبب یہ بیان کیا ہے کہ :

”جب خواص کتاب دیکھیں گے اور ان کو معلوم ہوگا کہ مؤلف اس علم کا عالم اور محقق گزر رہا ہے تو اس کا مطالعہ زیادہ توجہ سے کریں گے اور اسے یاد رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح مصنف اور پڑھنے والے دونوں کا مقصد بخوبی پورا ہوگا۔“

✓ مجتہد از تصنیف

داماد صاحب نے بتایا ہے کہ تصوف کے مختلف پہلوؤں پر متعدد مصوفیائے کتابیں لکھی ہیں اور پھر ان کی نشان دہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کشف المحجوب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جس کسی کے پاس بھی یہ کتاب موجود ہو اسے دوسری کتابوں کی ضرورت نہ رہے۔ ہندوستان میں جہاں اسلام تیا تیا آیا تھا۔ وہاں ایسی جامع کتاب کی ضرورت محتاج بیان نہیں کیونکہ یہاں صوفیوں کے اماموں کی کتابیں دستیاب نہ ہوں گی۔

مولانا عبد اللہ درویش آبادی نے ”کشف المحجوب“ کا اس کی ایک ہم عمر کتاب ”القشیریہ“ سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام ابولہت اسم قشیریؒ نے زیادہ تر متقدمین کے اقوال و حکایات کے نقل کر دینے پر اکتفا کی ہے۔ یہ خلاف اس کے مخدوم جویری ایک مجتہد از انداز سے اپنے ذاتی تجربات، مکاشفات، وادیات، مجاہدات وغیرہ بھی قلمبند کرتے جاتے ہیں اور مباحث سلوک پر رد و قدح کرنے میں کامل نہیں کرتے۔ اس لئے ان کی کتاب کی حیثیت محض ایک مجموعہ روایات و حکایات کی نہیں بلکہ ایک مستند محققانہ تصنیف کی ہے۔ یقیناً اسی خوبی کی بنا پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ”کشف المحجوب“ کو مرشد کا درجہ دیا ہے۔

دوسری تصنیفات

”کشف المحجوب“ میں داماد صاحب نے اپنی جن سابقہ کتابوں کا حوالہ دیا ہے

ان کی تعداد نو ہے۔ داتا صاحبؒ نے ان کے جو نام اور موضوعات بیان کئے ہیں — وہ حسب ذیل ہیں :

- ۱۔ دیوان شمس : کسی نے اسے مانگ کر اپنے نام منسوب کر لیا تھا (صفحہ ۲)
 - ۲۔ منہاج الدین : یہ بھی چوری ہو گئی تھی۔ یہ کتاب طریق تصوف کے بیان میں تھی۔ (صفحہ ۲) اس میں اصحاب صفہ کے مناقب تفصیل سے بیان کئے ہیں (صفحہ ۸۴) اور اس میں حضرت الحسین بن منصور علاج کے احوال کی ابتدا اور انتہا کو بیان کیا ہے (صفحہ ۱۶۰)
 - ۳۔ اسرار الخرق والموئنات : گدڑی پہننے کے آداب و شرائط پر (صفحہ ۵۳)
 - ۴۔ کتاب فنا و بقا : بچنے اور علمی ناپستگی کے دور میں لکھی گئی۔ (صفحہ ۵۷)
 - ۵۔ حضرت حسین بن منصور علاج کے کلام کی شرح لکھی لیکن اسکا نام نہیں بتایا۔ (صفحہ ۱۶۰)
 - ۶۔ کتاب البیان لابل العیان : جمع و تفرقہ کی بحث میں یہ کتاب ابتداء کے حال میں لکھی تھی۔ (صفحہ ۷۸۳)
 - ۷۔ بحر القلوب : اس میں باب جمع میں ایک طویل فصل بیان کی ہے (صفحہ ۲۸۳)
 - ۸۔ الرعایت لحقوق اللہ : اثبات توحید کے بیان میں اور عجوبوں، طبعیوں — فلکیوں اور معتزلہ وغیرہ کی تردید میں لکھی گئی (صفحہ ۳۰۵)
 - ۹۔ ایمان کے بیان میں ایک علیحدہ کتاب لکھی ہے مگر اسکا نام نہیں بتایا (صفحہ ۳۱۲)
- ان کتابوں میں ایک مختصر رسالہ "کشف الاسرار" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس کے کئی ترجمہ شائع ہو چکے ہیں لیکن داتا صاحبؒ سے اسکی نسبت محقق نہیں ہے !
- ② داتا صاحبؒ کی ان کتابوں میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہی یا ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی۔ داتا صاحبؒ نے "کشف المحجوب" میں مذکورہ فہرست کی پہلی دو کتابوں کے

سریقہ کی اطلاع دی ہے اور باقی کے بارے میں لکھا ہے کہ :

”میں نے فن تصوف میں کئی کتابیں لکھی تھیں جو سب ضائع

ہو گئی ہیں اور تصوف کے چھوٹے مدعیوں نے ان میں سے بعض

باتیں لوگوں کو پھانسنے کے لئے چُن لیں اور باقی کو دھوکہ مضائع کر دیا“

”کشف المحجوب“ کے مطالعہ سے مترشح ہے کہ سبھی کتابوں کے ضائع ہو جانے کے بیان میں

قدس مبالغہ پایا جاتا ہے کیونکہ داتا صاحب نے مذکورہ فہرست میں سے دو کتابوں کے محفوظ رہ

جانے کی خود اطلاع دی ہے اور پڑھنے والوں کو تفصیلی مطالعہ کے لئے ان سے رجوع کرنے

کا مشورہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

”گدڑی کے احباب و شرائط کے بارہ میں میری ایک علیحدہ کتاب

”اسرار الخرق والمومنات“ ہے۔ اس کا ایک نسخہ مرید کے پاس

ہونا چاہیئے“

دوسری کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے توحید کے اثبات میں اور توحید

کے منکروں کے رد میں ایک علیحدہ کتاب لکھی ہے جس کا نام ”الرعايت لحقوق الله“ رکھا ہے

متعلم کو یہ سہ میری اس کتاب میں تلاش کرنا چاہیئے یا متقدمین اہل اصول رضی اللہ عنہم کی

کتابوں سے رجوع کرنا چاہیئے۔ کشف المحجوب تو کسی زمانے میں بھی شائقین کی نظر سے اہل نہیں

رہی مگر قیاس کہتا ہے کہ اگر تلاش کیا جائے تو کیا محجوب کہ اور نہیں تو یہ دونوں کتابیں مل جائیں گی۔ (۷)

*

سیاحت

والہا صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ عالم اسلام کی سیاحت میں گزرا۔ کشف المحجوب میں سفر کو حصولِ مطلب کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ سفر تصوف کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے والہا صاحب نے حضرت جنیدؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ :

”تصوف اکٹھا خصال پر مشتمل ہے : (۱) سخاوت (۲) رضا

(۳) صبر (۴) اشارہ (۵) عزیت (۶) صوف پوشی ۔

(۷) فقر اور (۸) سیاحت“

پھر ان میں سے ہر ایک کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”سیاحت حضرت عیسیٰؑ کا اتباع ہے کہ ساری عمر تبلیغِ حق کے لئے

سیاحت کرتے رہے۔“

کوئی دنیا دار کسی بھی مقصد کے لئے سیاحت پر روانہ ہو سکتا ہے لیکن صوفی کا معاملہ دوسرا ہے

والہا صاحبؒ نے وہ مقاصد متعین کر دیئے ہیں جن کے لئے کوئی صوفی سفر اختیار کر سکتا ہے۔ لکھتے ہیں :

”سفر صرف اللہ کے لئے کیا جائے اور اس میں کوئی مادی خواہش

شامل نہ ہو۔ ہمیشہ یاد منور ہے اور اپنے اور ادو وظائف کو جاری

رکے۔ سفر صرف ان پانچ مقاصد کے لئے اختیار کرے :

(۱) حج (۲) غزوہ (۳) باطنی فوائد کے حصول کیلئے زیارات

(۴) تحصیلِ علم اور (۵) کسی بزرگ سے ملاقات — ان کے علاوہ کسی مقصد کے لئے سفر کرنے والا خطاوار ہوگا۔

مسلمان سفر

ریلوں۔ موٹروں اور عمدہ سڑکوں پر سفر کے عادی لوگ ان مشکلات کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے جو آج سے ایک ہزار سال پہلے کے مسافروں کو درپیش تھیں۔ آج کی بہ نسبت اس زمانے میں مسافر کو سواری اور زاد راہ کی ضرورت زیادہ تھی لیکن صوفیوں کو اسکی ممانعت تھی ولما صاحب فرماتے ہیں کہ :

”مسافر کے پاس بس اتنا سامان ہونا چاہیئے :

(۱) ستروپی کے لئے ایک گدڑی

(۲) نماز ادا کرنے کے لئے ایک مصلیٰ

(۳) وضو کے لئے لوٹا

(۴) وضو کے بعد پہننے کے لئے کفش اور

(۵) ضرورساں جانوروں کو ہٹانے کے لئے ایک چھتری

اگر کوئی شخص سنت کی پیروی کرتے ہوئے اس سے زیادہ سامان رکھے

جیسا کہ کنگھی، ناخن تراش، سوئی دھاگہ اور سرمرہ وغیرہ تو یہ بھی جائز ہے۔

لیکن اس سے زیادہ سامان اور ذاتی زیب و زینت ممنوع ہے۔ اگر مسافر ارادت

کے مقام میں ہے تو اس سے زیادہ سامان سفر قبیح، بت، دیوار اور حجاب ہوگا

اور اسکے نفس کی سرکشی اور رعونت کا اظہار کرے گا۔ ہاں البتہ اگر مسافر تمکین

و استقامت کے مقام میں ہے تو مذکورہ سامان سے زیادہ بھی رکھا جا

ایک مصطفیٰؐ کے لئے ایک چھڑی

ہمارے داتا صاحبؒ کے صاحب تمکین ہونے میں کوئی کلام نہیں تاہم آپ جس بے سرو سامانی کے ساتھ لاہور تشریف لائے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے خود بھی بوٹے، مصطفیٰ، نعلین اور ایک چھڑی کے سہارے مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحل سے لے کر مشرق میں گنگ و جمن کے کناروں تک — شمال میں ایک طرف بحیرہ خزر (کسپین)، اور دوسری طرف تاشقند سے لیکر خلیج فارس کے ساحل تک سفر کیا۔ داتا صاحب کے سفر کا نقشہ کھینچنا محال ہے تاہم خود کشف المحجوب میں کہیں واضح طور پر اور کہیں اشارۃً جن شہروں کی سیاحت کا ذکر کیا ہے۔ ان میں دمشق۔ رملہ۔ بیت الحن۔ آذربائیجان۔ سمرقند کے مشرق میں جبل بتم۔ بغداد۔ خوزستان۔ فارس۔ طوس۔ نیشاپور۔ میہنہ۔ بسطام۔ سندھس مرو۔ بخارا اور اذکند شامل ہیں۔

سیاسی حالت

داتا صاحبؒ کی زندگی کے اوائل دنوں میں پنجاب سے لیکر مغربی ایران تک کا علاقہ غزنویوں کے قلمرو میں شامل تھا لیکن آخری دور میں افغانستان کے کچھ حصے، ماوراء النہر اور خراسان کے علاقے ان کے ہاتھوں سے نکل کر سلجوقیوں کے پاس چلے گئے۔ — زیریں ایران میں بوید خاندان حکمران تھا، کچھ علاقوں میں ویلی راج کر رہے تھے۔ شام، اردن، لبنان اور فلسطین کے علاقے مصر کے فاطمی خلفاء کے زیر نگین تھے۔ ان میں سے بعض حکمران غیر مسلم علاقوں میں جہاد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اس سے جو وقت بچا وہ سمجھی حکمران آپس میں لڑنے بھڑکنے میں مصروف رہتے تھے۔ مسلمانوں کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں نے سیاسی انتشار پھیلادیا تھا۔

فکری انتشار

داتا صاحبؒ کے زمانہ میں مسلمانوں کا فکری انتشار بھی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ مشہور سیاح ابو عبد اللہ محمد المقدسی البشاری نے ۳۷۵ھ / ۹۸۵ء میں اپنا سفر نامہ : "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" شائع کیا۔ اس نے صرف جغرافیائی حالات قلمبند نہیں کئے۔ بلکہ عوام کے عقائد اور معاشرتی حالات پر تبصرہ کر کے اپنی تصنیف کو لاجواب بنا دیا ہے۔

مقدسی نے عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں فکری انتشار اور سرقہ پرستی کی جو تصویر کھینچی ہے، اسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ داتا صاحبؒ نے بھی کشف المحجوب میں جگہ جگہ اپنے زمانے کی خرابی کا جو گلہ کیا ہے، اس کی وجہ پوری طرح سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اب ہم کشف المحجوب کے ذریعے داتا صاحب کی سیاحت کو بیان کرتے ہیں۔ معاشرتی پس منظر کی وضاحت کے لئے مقدسی کا بیان نقل کر دیا جائیگا۔

طوس

داتا صاحبؒ نے طوس میں حضرت ابوالقاسم گرگانیؒ سے ملاقات کا ذکر کئی جگہ کیا ہے۔ مثلاً گدڑی کے باب میں لکھتے ہیں :

"میں نے کہ علی بن عثمان جلابی ہوں ، طوس میں شیخ المشائخ

ابوالقاسم گرگانیؒ سے دریافت کیا کہ درویش کو کم سے کم کن

چیزوں کا علم ہونا چاہیئے ؛ انھوں نے فرمایا : تین چیزوں کا :

(۱) چیمڑا سیدھا سینا جانتا ہو (۲) سچی بات سننا جانتا

ہو اور (۳) پاؤں کو زمین پر صحیح رکھنا جانتا ہو۔"

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”گڈی حقیقی فقر کے لئے ہو زیب و زینت کے لئے نہ ہو۔ بات

کو حال کے ساتھ سنیں نہ کہ قال کے ساتھ۔ زمین پر صحیح طرح پاؤں

رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری رواج اور لہو کے لئے نہیں، بلکہ

جذبہ محبت الہی میں زمین پر پاؤں رکھا جائے۔“

شیخ ابوالقاسم نے یہ تشریح سنی تو فرمایا: ”علی نے سچ کہا ہے اللہ اسے نیکی دے“

مقدسیت بتاتا ہے کہ طوس کے سارے باشندے امام شافعی کے مقلد ہیں اور وہاں

ان کی فتنہ پر عمل ہوتا ہے۔“

سرخس

حضرت داتا صاحبؒ نے سرخس میں خواجہ امام خزاہیؒ سے اپنی ملاقات کا حال ۲۲

پر لکھا ہے۔ مقدسی ہمیں بتاتا ہے کہ سرخس میں خنفیوں کے فرقہ مرد سیہ اور شافعیوں کے

فرقہ اہلۃ کے درمیان سخت عداوت پائی جاتی ہے۔

نسا۔ مرو

داتا صاحبؒ نے فرقہ سیاریہ کے ضمن میں نسا اور مرو کی سیاحت کا ذکر ایک ساتھ

کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان شہروں میں حضرت ابوالعباس سیاریؒ کے پیروکار موجود ہیں

اور یہ کہ انہوں نے مرو میں حضرت سیاریؒ کے رسالے اور خطوط کا مطالعہ کیا ہے۔

مقدسیت نے لکھا ہے کہ نسا خوبصورت درختوں میں چھپا ہوا صاف شہر ہے۔

جامع مسجد خوش نما ہے۔ شہر مذہبی عیاروں کا اکھاڑہ ہے۔ مذہبی تعصب نے اجتماعی

عافیت برباد کر دی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ نسا کے عالموں نے قرآن تک میں افتادہ کر دیا

ہے۔ اذان ترجیح سے دی جاتی ہے یعنی شہادت کے دونوں کلموں کو پہلے دودو بار
بلکی آواز سے اور پھر دودو بار بلند آواز سے ادا کیا جاتا ہے۔ بہت سے معاملات میں
اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں ہوتا۔

مرو کے بارے میں لکھا ہے :

”شہر کے وسط میں جامع مسجد ہے۔ شہر میں بیدار مغز اور باشعور
اکابر موجود ہیں۔ ہر رات وعظ اور مباحثے ہوتے ہیں۔ واعظ فقہ کا
علم رکھتے ہیں اور امام ابو حنیفہ کے مقلد ہیں۔ مدارس میں طلباء کو
وظائف دیئے جاتے ہیں۔ لوگوں میں فیاضی اور مردت کی کمی ہے۔
وسائل رزق تنگ ہیں۔ باشندے شاطر اور فتنہ پرور ہیں۔
فسادات کی وجہ سے شہر کی آبادی کم ہو گئی ہے اور اکثر مکان
اُجڑ گئے ہیں۔ شہر میں بدکاریاں پھیلی ہیں اور برابر جھگڑے فتنے
ہوتے رہتے ہیں۔ باشندے طعن اور طنز اور احمقانہ حرکتوں کے
خوگر ہیں!“

داتا صاحبؒ نے لکھا ہے :

”ایک دفعہ میں مرو میں تھا کہ ائمہ اہلحدیث میں سے ایک نے جو
سب سے زیادہ مشہور تھے مجھ سے کہا : کہ انہوں نے سماع کی
اباحت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ دین میں
ایک بڑی مصیبت پیدا ہو گئی کہ حضرت امام نے ایک لہو کو جو
تمام بدکاریوں کی اصل ہے ہلال کر دیا ہے۔“

نیشاپور

کشف المحجوب میں نیشاپور کی سیاحت کا ذکر واضح طور پر نہیں کیا گیا۔ تاہم نیشاپور

کے کئی بزرگوں اور واقعات کا ذکر آیا ہے۔ ان میں داتا صاحب کے معاصر جنہیں بڑے ادب سے استاد ابوالقاسم قشیری لکھتے ہیں — نیشاپور میں ہی آرام فرما ہیں نیشاپور خراسان کا صدر مقام تھا لہذا داتا صاحب نے وہاں کی سیاحت ضرور کی ہوگی۔ مقدسی اسے عالم اسلام کا لائانی شہر قرار دیتا ہے مگر افسوس کرتا ہے کہ یہاں کے بلوؤں اور جھگڑوں کو دیکھ کر عقل چرغ ہوتی ہے اور مذہبی تعصبات کا مشاہدہ کر کے دل ٹکڑے ہوتا ہے۔ شیعوں اور کرامیوں کا طوطی بولتا ہے۔ عوام انہی دو فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ فقہاء کی مٹی پلید ہے۔ عوام کا حال یہ ہے کہ جہاں کسی مہر پھرے نے کوئی نعرہ لگایا اس کے پیچھے ہوئے — مذہبی تعصب کا زہر بڑی طرح پھیلا ہوا ہے۔

یہ سب شہر خراسان کے ہیں اور خراسان داتا صاحب کے زمانہ میں صوفی تحریک کا بہت بڑا مرکز تھا۔ داتا صاحب نے 'کشف المحجوب' میں خراسان کے متاخرین صوفیاء کا مختصر حال لکھا ہے، اس فصل کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے کہ :

”اہل خراسان کہ آجکل وہاں اقبال حق کا سایہ ہے۔“

فصل کے آخر میں لکھتے ہیں :

”اگر میں اہل خراسان میں سے سب بزرگوں کو شمار کروں تو کتاب طویل ہو جائے گی۔ میں نے تین سو صوفی صوف خراسان میں دیکھے ہیں اور یہ ایسے تھے کہ ان میں سے ایک ایک ساری دنیا کے لئے کافی تھا۔ وجہ یہ ہے کہ خراسان کے آسمان پر آفتاب محبت اور اقبال طریقت جلوہ دکھا رہا ہے۔“

مقدسی کے زمانہ سیاحت میں خراسان پر آل سامان کی حکومت تھی۔ وہ لکھتا ہے سامانی سلاطین اپنے دربار میں علماء کو زین بوسی پر مجبور نہیں کرتے جمعہ کی رات کو ان کے دربار میں مناظرہ اور مباحثہ کی مجلسیں ہوتی ہیں

جن میں بڑے بڑے فاضل شریک ہوتے ہیں۔ سلاطین کا رجحان فقہ حنفی کی طرف ہے۔ ان کا وزیر بخارا کا سب سے ممتاز فقیہ اور راست باز شخص ہوتا ہے۔ مقدسی لکھتا ہے کہ خراسان کی مجموعی زندگی راہ راست پر ہے مگر بعض شہروں جستان۔ ہراۃ کے مضافات یعنی استرہیاں اور کرغخ میں خارجیوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ نیشاپور میں معتزلہ نمایاں ہیں، شیعوں اور کرامیوں میں بحث و مناظرے ہوتے رہتے ہیں۔

ماوراء النہر

دریائے جیوں کے اوپر والے پورے علاقہ کو ماوراء النہر کہتے ہیں لیکن مقدسی اسے سبیل لکھتا ہے۔ کشف المحجوب میں داتا صاحب نے ماوراء النہر میں اپنی سیاحت کا ذکر کئی جگہوں پر کیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۴۸ پر لکھا ہے کہ :

”ماوراء النہر میں ایک بوڑھے کو دیکھا جو عام لوگوں کے استعمال کے لائق چیزیں استعمال نہیں کرتا تھا“

پھر صفحات ۲۵۶ پر باب عمر کی ملاقات کے لئے اذکند سے سلاطک تک جانے کا قصہ بیان کیا ہے۔ پھر صفحہ ۳۹۸ پر بخارا میں ایک ایسے بزرگ کو دیکھنے کا بتایا ہے۔ جو چالیس سال سے رات کو نہیں سوئے تھے۔ نیز متاخرین صوفیاء کے ذیل میں ماوراء النہر کے خجہ ایسے بزرگوں کا حال لکھا ہے جن سے ملاقات رہی تھی۔ ”ان کو دیکھا اور ہر ایک کے حال کو معلوم کیا“

مقدسی لکھتا ہے کہ ماوراء النہر ہمہ صفت صوبہ ہے۔ ہر ملک سے زیادہ سرسبز و شاداب ہے۔ کسی ملک میں نہ تولد تھے فقیہ ہیں نہ علم کا ایسا چرچا ہے نہ مذہبی زندگی ایسی مضبوط و مستقیم پر ہے۔ ادب اور حدیث سے لوگوں کو خاص شغف ہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ دن رات جاری رہتا ہے۔ ماوراء النہر کے شہر تاشقند کے بارے میں لکھتا ہے :

کہ یہاں خوبوں اور خرابیوں کا پلہ برابر ہے۔ ایک طرف ازدانی ہے تو دوسری طرف جھگڑے
خوب ہوتے ہیں۔ یا شدے سنی ہیں لیکن مستعقب۔ سمرقند میں علم کا بڑا چرچا ہے۔
اور حبید عالم فاضل موجود ہیں۔

بخارا کے بارے میں لکھتا ہے کہ ساری مسجدیں خوشنما ہیں اور نمازیوں سے بھری
رہتی ہیں۔ جہلا اور آن پڑھوں کی تعداد کم ہے۔ واعظ، فقہرہ اور تفسیر کا علم رکھتے
ہیں۔ یہاں باہر کے بہت سے لوگ آگئے ہیں جنہوں نے برائیاں پھیلانا شروع کر دی
ہیں۔ یہ لوگ بد معاملہ ہیں اور نماز یا جماعت کو غنیمت ضروری سمجھتے ہیں۔ درباری مقریوں کا
ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو ریشم اور دیباچ پہنتا ہے۔ سونے چاندی کے برتنوں
میں کھانا کھاتا ہے اور مذہبی معاملات سے بے اعتنائی برتا ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ:
فرغانہ۔ سمرقند اور خستل میں کرامیہ فرقہ کی خانقاہیں ہیں۔ دیہاتوں میں ایک فرقہ ہے
جسکو سفید پوش کہتے ہیں۔ اس کا مذہب زندقہ سے مشابہ ہے۔ ترمذ کے کشر
باشدے بھی ہیں۔

آذربائیجان

دانا صاحب نے کشف المحجوب میں آذربائیجان کی سیاحت کا بھی ذکر کیا ہے۔
ایک بار اپنے شیخ کے ساتھ آذربائیجان میں جا رہے تھے کہ چند گھڑی پوشوں کو ایک زمیندار
کے آگے جھولی پھیلائے دیکھا تو شیخ سے پوچھا کہ یہ لوگ کس درجہ سے اس بلا میں مبتلا
اور مخلوق کے سامنے رسوا ہوئے؟ تو شیخ نے فرمایا: کہ ان کے پیروں کو مرید جمع کرنے کی
حرص تھی اور انہیں دنیا جمع کرنے کی۔ پھر آذربائیجان کے پہاڑوں میں ایک درویش
کا چشم دید واقعہ لکھا ہے کہ وہ اشعار پڑھتا اور گریہ زاری کرتا جا رہا تھا۔ آخر ایک پھر سے
ایک لگا کر بیٹھ گیا اور جان اللہ کے سپرد کر دی۔ دانا صاحب نے سناؤ خیر موفیاً

کے ذیل میں قستان۔ آذربائیجان اور طبرستان کے مشترکہ عنوان سے نو بزرگوں کا ذکر کیا ہے^{۲۱}
 مقدسی میں بتاتا ہے کہ قستان کے باشندے حنفی ہیں۔ بحیثیت مجموعی امام شافعی
 کا مسلک غالب ہے۔ شیعوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ آذربائیجان کے بارے میں لکھتا ہے کہ
 اس کا صدر مقام اردبیل ہے۔ شہر میں ہر وقت فوج رہتی ہے۔ باشندے نجیل، اور
 بارخاطر ہیں۔ عاملوں کا فقدان ہے، واعظ فقہ سے نا آشنا ہیں اور لوگ مذہبی تعصب میں
 گرفتار ہیں۔ شیعہ نہیں پائے جاتے۔ علم کلام سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ تصوف کی طرف
 میلان زیادہ ہے۔ دیلی میں ایک خانقاہ بھی ہے۔ طبرستان کے بارے میں لکھتا ہے کہ
 اصل اس کا صدر مقام ہے کچھ پختہ ختنے حنفی ہیں باقی یاقوتی ہیں یا شافعی پہاڑی علاقہ میں کرامیہ فرقہ
 کی خانقاہیں ہیں۔ بعض حصوں میں شیعوں کا زور ہے۔^{۲۲}

خوزستان

دانا صاحب نے حضرت حسین بن منصور الحلاجؒ کے سوانحی خاکہ میں خوزستان کی
 سیاحت کا اشارہ ذکر کیا ہے کہ آپ نے الحلاج کی تصنیفات کے بعض نسخے خوزستان
 میں دیکھے ہیں۔^{۲۵}

مقدسی نے خوزستان کو عقائد کا اکھاڑہ بتایا ہے۔ لکھتا ہے: واعظ فقہ گو ہیں،
 اور مسجدوں میں اودھم مچائے رکھتے ہیں۔ صدر مقام ابواز کو چھوڑ کر ہر شہر میں زاہد و
 عابد پائے جاتے ہیں مسکرمکرم کو چھوڑ کر ہر جگہ صوفی اور خانقاہیں موجود ہیں۔ صوفیوں کا ایک
 فرقہ حبیبیہ ہے جو ناپچ گانے کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ ان کے بہت سے رواج غیر
 اسلامی ہیں اور اخلاق ناپسندیدہ۔

ابواز کے بارے میں لکھتا ہے کہ شہر لوں میں نہ شرافت نہ بی بیہ زدن ایمان۔
 جامع مسجد میاروں اور قلندروں کا اڈا ہے۔ خوزستان کے ایک اور شہر سوس کے بارے میں

لکھتا ہے: لوگ اہل سنت والجماعت ہیں۔ جامع مسجد عمدہ ہے۔ مگر اس کے دروازوں کے پاس چکلے کھلے ہوئے ہیں۔ عسکر مکرم کے علماء کو علم الکلام اور اعتزال سے شغف ہے۔ اس لئے عوام ان سے نفرت کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر مذہبی حالت یہ ہے۔ خوزستان اعتزال کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ کسی دوسرے ملک میں یہاں سے زیادہ معتزلی نہیں پائے جاتے، عسکر مکرم والے تو سو فیصد معتزلی ہیں۔ ایہواز کے نصف باشندے شیعہ ہیں جو سنی فرقہ فضلی کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ اسی طرح عسکر مکرم اور تہتر کے مابین بھی تعصب کی وجہ سے لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہتر والوں نے ایک مرتبہ سو سے حضرت دانیال کا تابوت منگوایا اور پھر واپس نہ کیا۔ اس سے دونوں شہروں کے درمیان تعلقات خراب ہو گئے۔^{۲۶}

فارس

دانا صاحب نے فارس میں حضرت الخلاج کی بعض تصانیف دیکھنے کی اطلاع دی ہے۔ (صفحہ ۱۵۹) اور پھر متاخرین صوفیاء کے باب میں فارس کے چھ بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔^{۲۷} مقدسی نے بتایا ہے کہ فارس کی حکومت کا مستقر شیراز ہے جو نو وجود شہر ہے۔ عالم ادب و ظرافت سے خالی ہیں۔ ثقہ اور عادل لوگ قوم لوط سے ہیں۔ تاجر زانی ہیں۔ میں نے علماء کا لباس پہننے والوں کو شراب کے نشہ میں دھت دیکھا ہے۔ قبرستان اور مقبرے بد معاشوں کے اڈے ہیں۔ یہاں کی جامع مسجد بے نظیر ہے جس میں درسی حلقوں کے علاوہ صوفیوں کی محفلیں گرم رہتی ہیں۔ مجموعی طور پر فارس میں متعدد مسلک و مذہب موجود ہیں مثلاً حنفی۔ شافعی۔ معتزلی۔ حنبلی اور شیعہ یہاں داؤدی ہر جگہ سے زیادہ ہیں، اور بڑے بارسوخ و مقتدر ہیں۔ احناف کی تعداد بھی کافی ہے لیکن غلبہ اہل حدیث کا ہے۔ ارجان اور ساحلی مقامات پر شیعوں کی تعداد زیادہ ہے۔ معاشرہ میں واعظوں کو عزت حاصل نہیں۔^{۲۸}

کرمان

داتا صاحب نے متاخرین صد فیاض کے باب میں کرمان کے بزرگوں پر ایک فصل قائم کی ہے جس میں تین کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جوانوں اور نوخیزوں میں بھی بعد کے امیدوار ہیں۔^{۲۹}

مقدس نے لکھا ہے کہ کرمان کی کھجور اتنی میٹھی ہوتی ہے کہ سادہ کھائی نہیں جاتی۔ اس کا صدر مقام سیرجان ہے۔ علماء معتزلی خیالات کے ہیں۔ خراسیر کھجور کی تجارت کا مرکز ہے۔ یہاں کی عورتیں بدچلن ہیں۔ ہر سال تقریباً ایک لاکھ اونٹ کھجور اٹھانے کرمان آتے ہیں تو زنا اور فساد کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ حیرفت کے ضلع کے باشندے حنفی ہیں۔ باقی مملکت میں بحیثیت مجموعی امام شافعی کا مسلک غالب ہے۔ فقہ کے ماہر کم ہیں۔ اہلحدیث کا اثر بڑھتا جا رہا ہے۔ ہم میں خوارج ہنگامے پچاتے ہیں۔ ان کی جامع مسجد الگ ہے۔ سیرجان میں معتزلی بہت ہیں۔ ضلع حیرفت کے علاقوں روڈکان۔ قوہستان۔ منوقان اور بلوچ علاقہ کے اکثر باشندے شیوہ ہیں۔

شام

داتا صاحب کے مرشد حضرت ابوالفضل محمد بن الحسین انجلی کا قیام زیادہ تر جبل لکام میں رہا۔ جبل لکام سلسلہ کوہ لبنان کا وہ حصہ ہے جو اظہار کیہ — اور مصیصہ کے متصل ہے۔ داتا صاحب نے صفحہ ۱۷۳ پر ان کا سوانحی خاکہ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ وفات کے وقت بیت الجن میں تھے جو بانیان اور دمشق کے درمیان سے رخصت کے وقت ان کا سر داتا صاحب کی گود میں تھا۔

اسی طرح صفحہ ۲۵ پر اپنے مرشد کے ساتھ بیت الجن سے دمشق جانے کا ایک

واقعہ لکھا ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۳۸۴ پر حسین بن منصور الحلاج کی مناجات کی تلاش میں دو درویشوں کے ساتھ دمشق سے رملہ جانے کا ایک واقعہ لکھا ہے، اور صفحہ ۱۰۱ پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار پر سونے کے دوران اپنا ایک خواب لکھا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔

مقدس لکھتا ہے کہ شام کے صدر مقام دمشق کے باشندے منفرد اور شہریدہ ہیں۔ اس کی واحد خوبی اور قیمتی سرمایہ ولید بن عبد الملک کی تعمیر کردہ جامع مسجد ہے۔ رملہ ضلع فلسطین کا صدر مقام ہے۔ کنوؤں کا پانی کھادی ہے لہذا بارش کا پانی حوضوں میں جمع کر لیا جاتا ہے۔ جن میں قفل ڈال دیے جاتے ہیں۔ نادار پیاسا رہتا ہے اور پرہیزی حیران و پریشان!

مقدس کا اپنا شہر بیت المقدس مرجع خلائق تھا۔ مگر وہ اپنے آبائی شہر کی فکری اور دینی حالت کا نقشہ کھینچنے میں ذرا بھی جانبدار نہیں لکھتا ہے:

”مظلوموں کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔ نادار پریشان رہتے ہیں۔

فقہاء کے پاس کوئی پھٹکتا نہیں۔ ادیبوں کو کوئی پوچھتا

نہیں۔ انصاف کی عدالتیں ہیں نہ تدریس کے حلقے مسجدوں

میں بھی زیادہ جمع نہیں ہوتا۔ شام پر مصر کے فاطمی خلفاء

حکمران ہیں۔ بیت المقدس میں حنفیوں کا ایک حلقہ ہے جہاں

وعظ ہوتا ہے۔ کرامیہ فرقہ کے علماء خانقاہوں میں وعظ دیتے

ہیں۔ طبریہ کے سارے نابلس اور قدس کے اُدھے باشندے

شیعہ ہیں۔ معتزلہ کے لئے ماحول سازگار نہیں اسلئے دبے

ہوئے ہیں۔ مالکی اور داؤدی فرقہ کے پیرو بھی یہاں نہیں پائے

جاتے۔ جامع مسجد میں محدث اوزاعی (متوفی ۱۵۷۰ھ/۱۱۷۳-۱۱۷۴ھ) کی
فتہ کا ایک درسی حلقہ ہے۔ شام پر فاطمیوں کے قبضے سے پہلے
اہل حدیث کے مسلک پر عمل ہوتا تھا اور فقہ شافعی مذہب
کے پیرو ہوا کرتے تھے۔ کوئی قصبہ یا شہر ایسا نہ تھا۔ جہاں
حنفی رہائے جاتے ہوں۔ کبھی کبھی ان کے حج بھی مقرر ہوتے تھے
لیکن آج فاطمی قانون و شریعت پر عمل ہوتا ہے۔^{۲۶}

عراق

داماد صاحب نے اپنی عمر کا کچھ حصہ امام ابو حنیفہؒ اور حضرت جنیدؒ کے شہر
بغداد میں گزرا تھا۔ مختلف شیوخ کے بیان میں بغداد، اسکے گلی محلوں اور مسجدوں
کا اس طرح ذکر کرتے ہیں جیسے شہر کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ حسین بن منصور الحلاج
کے سوانحی خاکہ میں، بغداد میں اپنی علمی سرگرمیوں پر یہ کہہ کر روشنی ڈالتے ہیں کہ :
”میں نے ان کی پچاس تصانیف تو صرف بغداد اور اس کے
نواح ہی میں دیکھی ہیں۔“^{۲۷}

اور پھر اسی باب میں لکھتے ہیں کہ :

”میں نے بغداد اور اس کے نواح میں بھیڑوں کے ایک گروہ
کو دیکھا ہے کہ الحلاج کے کلام کو اپنے ذمہ کی حجت قرار دیتا
ہے اور اپنا نام حلاجی رکھتا ہے، اور ان کے معاملہ میں اسی طرح
مبالغہ کرتا ہے جس طرح کہ رافضی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے
معاملہ میں غلو کیا کرتے ہیں۔“^{۲۸}

اس کے بعد فرقہ حلوئیہ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ :

”میں نے ابو جعفر سید لانی اور چار ہزار آدمیوں کو دیکھا ہے۔ جو

عراق میں پھیلے ہوئے تھے اور سب کے سب حلاجی تھے۔“

اس کے بعد اقامت میں محبت کے آداب میں اپنا ایک واقعہ لکھا ہے۔ کہ
 دیارِ عراق میں قیام کے دوران طلبِ دنیا اور اسے بے دریغی سے خرچ کرنے میں
 مصروف تھے، یہاں تک کہ بہت زیر بار ہو گئے۔ جس کسی کو حاجت ہوتی، وہ
 آپ کے پاس پہنچ جاتا۔ یہ دیکھ کر ساداتِ وقت میں سے ایک نے لکھا کہ اے بیٹے
 خردوار! اپنے دل کو خدا کی یاد سے ہٹا کر خواہشِ نفس کے مارے ہوئے لوگوں میں نہ
 لگا۔ اس کام سے ہاتھ اٹھالے کیونکہ خود خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے کافی ہے
 پھر سوال اور ترک سوال کے باب میں کوفہ کا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے
 کہ ایک باحشمت صوفی کو دیکھا جو بھوک کے مارے محسوس سے نکل کر بازار میں آئے
 ایک ہاتھ پر ایک چڑیا بٹھا رکھی تھی اور کہہ رہے تھے کہ کون ہے جو مجھے اس چڑیا کے
 واسطے کچھ دے۔ لوگوں نے اعتراض کیا تو کہا: میرے لئے خدا کے واسطے سے دنیا
 مانگنا جائز نہیں۔“

مقدسی نے عراق کے متاخر بیان کرنے کے بعد دارالخلافہ بغداد کے بارے میں لکھا
 ہے کہ کسی زمانے میں بے حد بارونق شہر تھا۔ لیکن جب عباسی خلفاء کمزور ہوئے تو اسکا
 زوال شروع ہو گیا۔ آبادی کم ہو گئی، شہر تقریباً اجڑ چکا ہے۔ جامع مسجد میں صرف جمعہ
 کے دن آبادی ہوتی ہے۔ شہر کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ
 سامرا کی طرح برباد ہو جائے گا۔ فتنے فساد، جہالت اور فسق و فجور کا بازار گرم ہے۔ مقامی
 حکومت ظالم ہے۔

کوفہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ شہر عظمت اور مدینیت میں بغداد
 کا ہم پلہ تھا مگر اب حالت خراب ہے۔ بیرونی جھگڑے ہیں۔ بصرہ کی مسجد شاندار

اور آباد ہے۔ بہت سے صالح لوگ رہتے ہیں مگر عجیب عجیب فتنے اٹھتے رہتے ہیں۔
عراق پر عباسی خلفا کی حکومت ہے جو سلاطین بویہ کے ماتحت ہیں (یہ ماتحتی ۹۶۸ء /
۵۵۰ھ تک رہی)۔

بغداد میں عراق کے بسند پایہ فقہا حنابلہ اور شیعہ عوام پر حاوی ہیں۔ ان کے علاوہ
یہاں مالکیہ، اشعریہ، معتزلہ اور بخاریہ فرقوں کے پیرو بھی موجود ہیں۔ بصرہ میں کافی لوگ
سالمسیہ فرقہ کے پیرو ہیں۔ کناہہ محلہ کو چھوڑ کر جو شنی ہے، کوفہ کے باقی سب لوگ شیعہ
ہیں۔

بصرہ کے بیشتر لوگ قدریہ ہیں۔ لیکن یہاں حنبلی بھی پائے جاتے ہیں۔ بغداد
کے حنبلی بڑے ثالی ہیں اور تشبیہ کے قائل۔ حنابلہ کی برہہ باری شاخ کو خاص طور پر امیر
معاویہؓ سے بے پایاں محبت ہے۔ عراق کے اکثر فقیہ اور جج حنفی مسلک کے ہیں۔
بصرہ میں قبیلہ ربیعہ کے شیعہ عرب اور قبیلہ سعد کے شنی عرب بڑے متعصب ہیں بصرہ
کے دیہات میں بھی شیعہ شنی تعصب کا اثر پہنچ گیا ہے۔

ترکستان

دانا صاحب سماع سے متعلقہ امور پر بحث کرتے ہوئے عادت اور طبیعت کے
بیان میں اپنی سیاحت ترکستان کا سراغ ایک چشم دیدہ واقعہ سے دے گئے ہیں:
"میں نے ترکستان میں اسلام کی سرحد پر ایک شہر میں دیکھا کہ
ایک پہاڑ میں آگ لگ گئی تھی اور وہ جل رہا تھا۔ اس کے پھر
سے نو شادراں نکل رہا تھا۔ اس آگ میں ایک چوڑا تھا جب وہ
اس آگ سے باہر نکلا تو ہلاک ہو گیا۔
یہ پہاڑ ممکن ہے کوئی آتش فشاں ہو اور چوہا وہ جانور ہو جسے فارسی میں سمندر کہتے

میں — داتا صاحب کی مراد غالباً روسی ترکستان سے ہے۔ مقتدی کے بقول اس سرحد پر آخری بڑا شہر سیحباب تھا جو سمرقند سے چھ مرحلے اور دو ہرید کے فاصلے پر شمال مشرق میں آباد تھا۔ یہاں دو ہزار سات سو سرحدی چوکیاں ہیں۔ شہر میں قراٹگین کی قبر ہے یہ ایک اہم سرحدی شہر اور مستقر جہاد ہے۔ جہاں لوگ ہر وقت ترکستانی بھاپہ ماروں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگوں سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔

یاقت دمتوفی ۵۹۲۶ھ / ۱۲۲۹ء نے معجم البلدان میں یہ اضافہ کیا ہے۔ سیحباب حدود ترکستان میں واقع تھا۔ ماوراء النہر اور خراسان میں یہ واحد شہر تھا جس کے باشندوں سے خراج نہیں لیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اس رقم سے اختیار خرید سکیں اور وہاں رہنے میں تکلیف محسوس نہ کریں۔ خوارزم شاہ محمد بن تکش بن الپ ارسلان نے اسے تباہ کر دیا۔ یہی سہی کسر ۵۹۱۶ھ / ۱۲۱۹ء میں چنگیزی یورش نے پوری کر دی۔



معاصرین

دانا صاحب کے یہاں صوفی وہ ہے جو کامل مسلمان ہو۔ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کو مسلمانی کا مکمل ترین نمونہ مانتے ہیں۔ اسی لئے دانا صاحب نے "کشف المحجوب" میں تصوف کے ابتدائی امور واضح کرنے کے بعد صوفیوں کی عملی مثالیں پیش کرنے کے لئے کلام کا آغاز خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے کیا ہے:

"اب ہم صحابہ رضی اللہ عنہم — سابقین اولین مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم میں سے ان اماموں کے بعض حالات بیان کرتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے بعد معاملات میں اہل تصوف کے پیش رو اور انفاس میں ان کے پیشوا اور احوال میں ان کے رہنما ہوئے ہیں۔"

اس باب کا آغاز حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے "تصوف کے بارے میں حالات" سے ہوا ہے۔ آپ کے بعد حضرت عمرؓ نے الخطاب رضی اللہ عنہ کے ... "طریقت میں نہایت لطیف اقوال اور باریک رموز بیان کئے ہیں — پھر حضرت عثمانؓ بن عفان رضی اللہ عنہ کے صوفیانہ احوال میں بتایا ہے کہ:

"صوفیا اپنے مال و جان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے، اپنے تمام امور کو خدا کے سپرد کرنے اور عبادت میں اخلاص کے اندر آپ ہی

کی اقتدار کرتے ہیں۔

آپ کے بعد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی، دریائے بلا کے غریق۔ آتش ولایت کے حریق اور تمام اولیاء اور برگزیدگان الہی کے پیشوا ابوالحسن علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے صوفیانہ حالات قلمبند کئے ہیں۔ ان کے بعد اہل بیت میں سے تصوف کے اماموں کا ذکر کیا ہے، ان کے بعد حضرات اہل صفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور پھر درجہ بدرجہ تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے صوفیاء کے اماموں کا بیان کرنے کے بعد اپنے زمانہ میں صوفیاء کے اماموں کا تذکرہ کیا ہے اور اس موضوع کا اختتام اپنے ایسے معاصرین کے ذکر سے کیا ہے جو انے والے زمانہ کے صوفیوں کے امام ہوئے۔

داتا صاحبؒ نے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے لے کر تبع تابعین رحمہ اللہ تک کے صوفیانہ افکار و اعمال پیش کر کے مکمل صوفی کا جو نمونہ پیش کیا تھا۔ اس کی تقلید رسمی صوفیوں کے بس کی بات نہ تھی۔ داتا صاحب ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :- "جب یہ پہلے بزرگوں کی باتیں سنتے اور ان کی عظمت کو دیکھتے ہیں اور اپنے اندر نگاہ ڈال کر ان اوصاف کا فقدان پاتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں کہ ان کی طرح ہیں نہ بن سکتے ہیں اور نہ ہی اس زمانے میں ایسے لوگ موجود ہیں۔"

داتا صاحب فرماتے ہیں :-

"ان کا یہ قول غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ زمین کو بے حجت کبھی نہیں چھوڑتا۔ ہر زمانے میں خدا کے نیک بندے موجود رہتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کی ہے کہ قیامت تک امت مسلمہ میں ایک گروہ ہمیشہ نیک اور حق پر قائم رہے گا۔ اس وضاحت کے بعد داتا صاحب نے "ائمہ صوفیائے متاخرین" میں سے دس بزرگوں کی تصویر کشی کی

کی ہے اور یہ امر واضح کر دیا ہے کہ :

" ان بزرگوں میں سے ایک گروہ گزر چکا ہے اور اپنی رُوح کو

راحت اور آرام پہنچا چکا ہے - دوسرا گروہ ان میں سے ابھی

تک زندہ ہے - اللہ تعالیٰ ان سے اور سب مسلمان مردوں اور

عورتوں سے راضی ہو "۔

داتا صاحب کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دس میں سے پانچ بزرگوں سے

براہِ راست اکتساب کیا ہے - ان میں سے پہلے بزرگ حضرت ابوالعباس احمد بن محمد

القضا ہیں جنہوں نے ماوراء النہر کے متقدمین صوفیاء کو دیکھا تھا - دوسرے بزرگ -

حضرت ابو علی بن حسین بن محمد الدقاق ہیں - دقاق کے معنی اُٹا فروش کے ہیں - سال

وفات ۵۴۵ یا ۵۴۶ھ / ۱۱۵۰ - ۱۱۴۱ء ہے - مہینہ ذی قعدہ تھا - تیسرے بزرگ

حضرت ابوالحسن علی بن احمد الخرقانیؒ ہیں - ۵۴۱ھ / ۱۱۴۵ء میں جب محمود غزنوی کو

سومناخہ کے معرکہ میں شکست کا خطرہ لاحق ہوا تھا تو انہی کی گدڑی کو ہاتھ میں لے کر فتح کی

دعائیں مانگی تھیں اور خواب میں ڈانٹ سنی تھی کہ اگر سارے ہندوؤں کے اسلام قبول کرنے کی

دعائیں مانگتا تو وہ بھی قبول ہو گئی ہوتی - ان کا دوسرا سال ۵۴۵ھ / ۱۱۴۳ء میں ہوا -

داتا صاحب نے حضرت خرقانیؒ کے واقعات شیخ ابوسعید فضل اللہ بن محمد المہینیؒ

کے خادم حسن مؤدب اور اپنے استاد ابوالقاسم قشیریؒ سے سُننے سے لئے۔

چوتھے بزرگ حضرت ابوعبد اللہ محمد بن علی المعروف بالداستانیؒ ہیں - داتا

صاحب نے ان کا ذکر شیخ سہیلکی سے سنا تھا - دارشکوہ نے ان کی عرفیت داستانی لکھی

ہے اور وفات رجب ۵۴۱ھ / ستمبر ۱۱۴۶ء میں بتائی ہے۔

پانچویں بزرگ حضرت ابوسعید فضل بن محمد المہینیؒ ہیں - ان کا ذکر شیخ ابوسلم ناری

رحمۃ اللہ علیہ سے سنا تھا اور ان کے مزار پر ایک حیران کن چشم دید واقعہ قلمبند کیا ہے

تاریخ وفات ۴ شعبان ۱۲۷۰ھ / ۱۲ جنوری ۱۰۷۹ء بتائی جاتی ہے۔ ان کے بعد ان بزرگوں کے احوال لکھے ہیں جن سے داتا صاحبؒ نے براہ راست اقتاب کیا تھا۔

حضرت ابو الفضل محمد بن الحسن النخشلؒ

حضرت ابو الفضل النخشلؒ داتا صاحب کے مرشد تھے۔ خنل کے رہنے والے تھے۔ جو بدخشاں کے مغرب میں دریائے جیوں کے ماٹیں کنارے پر ایک علاقے کا نام ہے۔ مقدسی نے اس کا صدر مقام ہلبک بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سرحد سندھ سے ملتی ہے۔ علاقہ بڑا خوشحال ہے۔ داتا صاحب نے بتایا ہے کہ آپ تفسیر اور حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ تصوف میں جنیدؒ کے پیرو حضرت حصریؒ کے مرید و زادہ بن اور ابو عمر قرظویؒ اور ابو الحسن بن سابر رحمہما اللہ کے ہم عصر تھے۔ بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ پورے ساٹھ سال تک سچی گوشہ نشینی کی وجہ سے پہاڑوں میں چھپے رہے۔ چھپن برس تک ایک ہی لباس پہنے رکھا، جہاں سے پھٹ جاتا وہاں پونڈ لگا لیتے۔ قیام زیادہ تر کوہ دکام میں رہا۔ کوہ دکام سلسلہ کوہ لبنان ANTI-TAUTUS کا وہ حصہ ہے جو انطاکیہ اور مصیص کے متصل ہے۔

آپ کی کرامتیں اور لیلیں بہت ہیں۔ آپ صوفیانہ رسم و لباس کے پابند نہ تھے بلکہ اہل رسم کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ لباس کے معاملہ میں داتا صاحب خود بھی کوئی التزام نہیں کرتے تھے۔ خدا نے گڈری دی تو وہ پہن لی قبا دی تو وہ پہن لی اور اگر ننگا رکھا تو ننگا رہنا ہی پسند کیا۔ کئی جگہوں پر مرشد کے ہمراہ سفر و سیاحت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جس دن انتقال فرمایا اس دن بیت الحن میں تھے جو باتیان اور دمشق کے درمیان ایک کھاٹی کے پاس ایک گاؤں ہے۔ مر داتا صاحب کی گودی میں رکھا تھا۔ لوگوں کی عادت کے مطابق داتا صاحب کے دل میں

ایک سچے دوست کی جدائی کا بڑا غم تھا۔ آپ نے داتا صاحب سے کہا۔
 ”اے پسر میں تجھے اعتقاد کا ایک مسئلہ بتاتا ہوں۔ اگر خود
 کو اس کے مطابق ڈھال لے گا تو سب رنجوں سے
 رہائی پائے گا۔ جان لے کہ سب مقامات و حالات میں
 نیک و بد اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اس لئے
 تجھے اللہ کے فعل پر نہ کوئی جھگڑا کرنا چاہیئے اور نہ
 دل میں رنج کرنا چاہیئے۔“

اس کے سوا کوئی بھی وصیت نہ فرمائی اور جان دے دی۔ ان کا سال وصال
 ۳۶۰ھ/۶۸-۱۰۶۷ء بتایا جاتا ہے۔

حضرت ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیریؒ

داتا صاحب نے ان کا ذکر ”اسلام کی زینت اور مسلمانوں کے بزرگ رہنما“
 کے اوصاف سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ

”آپ کا حال اور فضیلتیں اہل زمانہ کو معلوم ہیں۔ ہر فن
 میں آپ کے لطیف اقوال اور محققانہ تصانیف موجود ہیں
 خدا تعالیٰ نے آپ کے حال اور زبان کو فضول باتوں سے
 محفوظ رکھا تھا۔ ایک دفعہ میں نے سنا کہ آپ فرمایا ہے
 ”میں نے تصوف کی مثال برسام کی بیماری (چھاتی کی سوجن)
 سینے کا درد پیمپیٹروں میں پانی بھر جانا جیسی ہے کہ اس
 کی ابتداء بکواس اور انتہا خاموشی ہے اور جب قائم
 ہو گئی تو بالکل گونگا رہ گیا۔“

اسی طرح فقر و غنا کے بارے میں استاد قشیریؒ سے سنا ہوا مقولہ رقم کیا ہے۔
 الحسین بن منصور الحلاجؒ کے تذکرہ میں استاد قشیریؒ کی یہ رائے لکھی ہے کہ :
 "اگر وہ اہل معانی و حقیقت میں سے ایک بزرگ ہوئے ہیں تو لوگوں
 کے ترک کرنے سے وہ ہرگز متروک اور مردود نہیں ہو سکتے۔ اور اگر
 وہ طریقت میں متروک اور حق تعالیٰ کی طرف سے مردود ہیں تو
 لوگوں کے قبول کرنے سے وہ مقبول نہیں ہو سکتے۔"
 حضرت خرقانیؒ کے تذکرہ میں لکھا ہے : ۷

"حضرت استاد قشیریؒ سے سنا ہے کہ آپ جب ولایت خرقان میں
 داخل ہوئے تو پیر کامل حضرت خرقانیؒ کی حشمت اور دیدہ کنی
 وجہ سے ساری فصاحت اور بیان کرنے کی طاقت جاتی رہی خیال
 ہوا کہ شاید اپنی ولایت سے معزول ہو گئے ہیں۔"

آگے چل کر استاد قشیریؒ سے حضرت طبرانی کے متعلق سنا ہوا واقعہ لکھا ہے کہ آپ کو
 پھر کی ضرورت تھی۔ سرخس کے دریا سے جو پھر اٹھاتے، موقی بن جاتا۔ اسے دریا میں پھینک
 دیتے کیونکہ آپ کے نزدیک دونوں یکساں حقیر تھے۔ پھر محبت کے بارے میں استاد
 قشیریؒ کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ محبت یہ ہے کہ محب اپنے کل اوصاف کو اپنے محبوب
 کی طلب میں محو کر دے اور یہ محبوب یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو ثابت کرنا ہے۔"

آخر میں استاد ابوالقاسم قشیریؒ کی ایک تصنیف کا حوالہ دیا ہے جو حقوق محبت
 کے موضوع پر مبنی۔ دانا صاحب نے اس کتاب کا نام نہیں لکھا۔ ہم تک حضرت قشیریؒ
 کی ایک ہی کتاب "رسالة القشیریہ" پہنچی ہے۔ شائد دانا صاحب کی مراد اسی کتاب
 سے ہو۔ ان کی تاریخ وفات ۱۱۰۱ ربيع الثانی ۴۶۸ھ / ۲۹ اکتوبر ۱۰۷۰ء ہے۔ مگر
 ابن خلکان اور جامیؒ نے ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء لکھی ہے۔

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد الاشعقانیؒ

والا صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت اشعقانیؒ اپنے وقت میں طریقت میں منفرد اور علم اصول و فروع کی تمام انواع کے امام تھے۔ بڑے جلیل القدر صوفی تھے۔ اور اپنے طریق کو معلق عبارت میں فنا سے تعبیر کرتے تھے اور یہ طرز تحریر انہی سے مخصوص تھا

"میں نے بعض جاہلوں کو آپ کے اس بیان کی تقلید کرتے دیکھا ہے حالانکہ تقلید تو معنی میں بھی اچھی نہیں ہوتی بلکہ عبارت کی تقلید کیسے درست ہو سکتی ہے"

اس کے بعد لکھتے ہیں :-

"مجھے آپ سے بہت اُنس تھا اور آپ کی بھی مجھ پر سچی شفقت تھی۔ بعض علوم میں میرے استاد تھے۔ شریعت کی از حد تعظیم کرتے تھے۔ مخلوق سے متعلق قطع کیا ہوا تھا۔ علم اصول میں آپ کی عبارت اس قدر مشکل تھی کہ محقق امام کے سوا کسی کو آپ سے فائدہ نہیں ہوتا تھا"

حضرت حسین بن منصور الحلاج کے باب میں لکھا ہے کہ شیخ ابوالعباس نے ان کے معاملہ کو راز میں رکھا ہے۔ مجاہدہ نفس کے باب میں ان کا یہ قول لکھا ہے کہ ایک دن گھر میں داخل ہوئے تو زرد رنگ کے ایک کتے کو اپنی جگہ سویا دیکھا۔ اسے نکالنے کا ارادہ کیا تو دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔ یہ نفس تھا۔ گیارہویں پردے کو کھولتے ہوئے اپنا پر واقعہ رقم کیا ہے :

"ایک روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو یہ آیت پڑھ رہے تھے

(ترجمہ) وہ غلام جو کسی دوسرے کا مملوک ہے اور کسی کام کو کرنے پر

قادر نہیں۔ یہ آیت پڑھ پڑھ کر اتنا روٹے کہ میں نے سمجھا کہ دنیا سے رحلت کر گئے۔ بعد ازاں میں نے پوچھا: اے شیخ! یہ کیا حالت ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ گیارہ سال سے میرا درس اس مقام تک پہنچا ہے اور اس سے آگے نہیں نکل سکا ہوں۔ میں نے پوچھا اے شیخ! آپ ہر روز کتنا قرآن پڑھتے ہیں؟ تو فرمایا: اس سے پہلے رات دن میں دو دفعہ قرآن ختم کیا کرتا تھا لیکن اب چودہ سال سے میں ابھی تک سورہ انفال تک پہنچا ہوں!

اسی طرح ہوس انگیز اشعار سننے کی کراہیت کے باب میں بھی آپ کی ایک روایت بیان کی گئی ہے۔ شیخ اشقانیؒ نے ۵۲۹ھ / ۱۰۸۶ء میں وفات پائی۔

حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبد اللہ الکرکافیؒ

دانا صاحب نے انھیں اپنے زمانہ کے ایک قطب اور یکتا لکھا ہے۔ طریقت کی خاطر کئی گھنٹوں سفر سخت شرائط کے ساتھ کئے۔ مریدوں کی الجھنیں دور کرنے میں بے مثال تھے۔ تمام اقسام کے علوم کے ماہر تھے۔ آپ کے مریدوں میں سے ہر ایک زمانے کا سرور ہوا ہے مثلاً حضرت ابو علی فضل بن محمد فارمدیؒ نے ساری دنیا سے اعراض کر کے اپنا حصہ شیخ کرکافیؒ کے حق میں چھوڑ دیا تھا (حضرت فارمدیؒ کے مریدوں میں امام غزالیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں) دیکھئے الغزالی صفحات ۲۱-۲۰

دانا صاحب لکھتے ہیں:

”ایک دن میں حضرت شیخ کے پاس بیٹھا اپنے احوال و مشاہدات

عرض کر رہا تھا کہ کھوٹے کھرے کی پرکھ ہو جائے۔ آپ اپنے وقت

کے بہترین نقاد اور کھرا کرنے والے ہیں۔ آپ میری معروضات

کو بڑے احترام سے سن رہے تھے اور مجھے بچپن کے غرور اور جوانی کی گرمی نے اس بات پر اگسایا کہ شاید حضرت شیخ کا ابتدا میں اس کو چہرے گزر ہی نہیں ہوا کہ آپ اتنی عاجزی اور انکسار ظاہر فرما رہے ہیں۔ آپ میرے باطن سے آگاہ ہوئے اور فرمایا: اے دوست! جان لے کہ میری یہ عاجزی نہ تیرے لئے ہے اور نہ تیرے حال کے لئے بلکہ میں یہ عاجزی احوال کے تبدیل کرنے والے مریدوں کو آداب صحبت سکھانے کی خاطر اختیار کرتا ہوں۔ یہ سب طالبان حق کے لئے عام ہے تیرے لئے خاص نہیں۔ جب میں نے یہ بات سنی تو حیران رہ گیا۔ آپ نے فرمایا: اے بیٹے! آدمی کو طریقت میں اس سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا کہ جب مرشد کسی کو طریقت سے وابستہ کرتے ہیں تو اسے طریقت کے حاصل کرنے کے لئے کاغذ و پتھر دیکھیل دیتا ہے اور جب اسے طریقت سے معزول کر دیتے ہیں تو وہ اپنا زعم باطل بیان کرنے سے بھی معذور ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد مجھے آپ سے بہت سے اسرار معلوم ہوئے؟

نفس کے باب میں بیان کیا ہے کہ شیخ گرگانی نے نفس کو ایک سانپ کی صورت میں دیکھا تھا۔ الحلاج کے ضمن میں لکھا ہے کہ حضرت گرگانی نے ان کے معاملہ کو راز میں رکھا ہے۔ کرامت اولیاء کے باب میں لکھا ہے کہ مجھے ایک مشکل مسئلہ پیش ہوا تو اس کے حل کے لئے طوس میں حضرت گرگانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب میں وہاں پہنچا تو آپ اپنے گھر کے نزدیک مسجد میں تنہا تھے اور میں نے دیکھا کہ عینہ میری اس مشکل کا حل ایک ستون سے بیان فرما رہے تھے۔ چنانچہ میں نے سوال کئے بغیر اپنا جواب پایا۔ میں نے پوچھا کہ اے شیخ!

آپ یہ واقعہ کس سے بیان فرما رہے ہیں؟ فرمایا: اے بیٹے حق تعالیٰ نے اس وقت اس ستون کو میرے لئے ناطق کر دیا اور اس نے مجھ سے سوال پوچھا۔
 آخر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ۔ ایک دن میں نے شیخ گزگانی سے پوچھا کہ صحبت کی شرط کیا ہے؟ تو فرمایا کہ صحبت میں اپنا حصہ طلب نہ کرے کیونکہ صحبت کی تمام خرابیاں اسی وجہ سے ہیں۔

حضرت گزگانی نے طوس میں ۵۰۴ھ / ۱۱۰۵ء میں وفات پائی۔

حضرت ابوالاحمد المظفر بن اسمد بن حمدان

صوفیائے متاخرین کے اماموں میں آخری تذکرہ آپ کا ہے۔ انہیں اولیاء کے رئیس اور اہل صفوت کے ناصح قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے آپ سے سنا کہ جو کچھ دوسرے بزرگوں کو وادیوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھرنے سے ملا وہ مجھے مسند اور بالائینی کے درمیان مل گیا ہے۔
 آگے لکھتے ہیں:

ایک روز میں موسم گرما میں آپ کے پاس سفر کا لباس پہنے تھکا ماندہ حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: اے ابوالحسن مجھے بتاؤ اس وقت تمہارا ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس وقت مجھے سماع کی ضرورت ہے آپ نے اسی وقت آدمی بھیج کر قوال اور اہل عشرت کی ایک جماعت کو بلایا۔ سماع کے ابتداء ہی میں بچپن کے جوش و ارادہ اور سوز و محبت نے مجھے بے تہرا کر دیا۔ جب کچھ وقت گزر گیا اور اس آفت کا جوش و غلبہ مجھ میں کسی قدر کم ہوا تو آپ نے مجھ سے پوچھا یہ سماع میزے لئے کیسا رہا؟ میں نے کہا: اے شیخ! میں بہت خوش ہوا

آپ نے فرمایا: ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ راگ اور کوڑے کی
 آواز تیرے لئے یکساں ہوگی کیونکہ سماع کی قوت اسی وقت
 ہوتی ہے کہ مشاہدہ حق نہ ہو۔ جب مشاہدہ حاصل ہو جائے تو سماع
 کی قوت معدوم ہو جاتی ہے۔ دیکھو اس سماع کو اپنی عادت نہ بنا
 لینا کہ طبیعتِ ثانیہ ہو جائے اور اس کی وجہ سے تم اصل مقصود
 سے باز رہ جاؤ۔^{۱۲}

ان کے بعد داتا صاحب نے اپنے ۴۳ معاصرین کا ذکر متاخرین صوفیائے کرام کے
 عنوان سے کیا ہے لکھتے ہیں:

”اگر میں ان تمام صوفیاء کا حال اس کتاب میں بیان کروں جو مختلف
 شہروں میں ہندوگانِ خدا کی اصلاح میں مشغول ہیں تو یہ کتاب طویل
 ہو جائے گی اور اگر بعض صوفیاء کا حال چھوڑ دوں تو کتاب کا مقصد
 پورا نہ ہوگا۔ اس وجہ سے میں اہل رسم کو چھوڑ کر اپنے عہد کے فقہاء
 ان صوفیاء اور مشائخ کے مختصر حالات لکھتا ہوں جو اباب معنی
 اور محرم اسرار ربانی ہیں۔“

اس کے بعد عالم اسلام کے مختلف خطوں کے ذیلی عنوان قائم کر کے مختلف بزرگوں پر
 ایک ایک دو سطریں لکھی ہیں۔

شام و عراق

۱، شیخ زکی ابن علاء: آپ اپنے وقت کے بزرگ مشائخ اور سرداروں میں سے
 تھے۔ میں نے آپ کو آتشِ محبت کے شعلوں میں سے ایک شعلہ کی طرح پایا۔ آپ کی
 کرامتیں اور وسیلیں ظاہر تھیں۔

(۲) شیخ بزرگوار ابو جعفر المصباح الصیدلانیؒ

آپ اہل تصوف کے رئیسوں میں تھے۔ تحقیق معارف میں آپ کو بڑی دسترس حاصل تھی۔ زبان بہت اچھی تھی اور حسین بن منصور حلاجؒ سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ میں نے آپ کی بعض تصانیف آپ ہی سے پڑھی تھیں۔

(۳) شیخ ابوالقاسم سدی :

آپ بڑے بامجاہدہ پیر اور نیک حال بزرگ تھے۔ درویشوں کے محافظ اور ان کے حق میں بہت اچھا اعتقاد رکھتے تھے۔

اہل فارس

(۴) شیخ الشیوخ ابوالحسن بن سائبؒ :

آپ تصوف میں نہایت فصیح زبان رکھتے ہیں اور توحید میں ان کا بیان نہایت واضح ہوتا ہے۔

(۵) شیخ مرشد ابوالسحاق بن شہریارؒ :

آپ باجماعت صوفیاء میں سے تھے اور پورا پورا انتظامی ملکہ رکھتے تھے۔

(۶) شیخ طریقت ابوالحسن علی بن بکر انؒ :

صوفی بزرگوں میں سے تھے۔ کشف المحجوب (صفحہ ۱۲۰) پر آپ سے حضرت ابی عبداللہ

محمد بن خفیف شیرازیؒ کے متعلق سنی ہوئی روایت رقم کی ہے۔

(۷) شیخ ابوسلمؒ : تادرا الوقت اور نیک حال بزرگ تھے۔

(۸) شیخ ابوالفتح سائبہؒ :

آپ اپنے باپ (ابوالحسن بن سائبہؒ) کے نیک بیٹے ہیں اور بلند درجات کے

امیدوار ہیں۔

(۹) شیخ ابوطالبؒ: آپ کلمات حق کے گرفتار تھے۔
 دانا صاحب نے تصریح فرمائی ہے کہ ان میں سے شیخ الشیوخ ابو اسحاق کو
 خود نہیں دیکھا تھا۔

قہستان، آذربائیجان اور طبرستان

(۱۰) شیخ شقیق فرج معروف بہ انجی زنجانیؒ:
 آپ بہت نیک سیرت اور پسندیدہ طریقت بزرگ تھے۔
 (۱۱) شیخ بدرالدینؒ:
 صوفیوں کے بزرگوں میں سے ہوئے ہیں۔ آپ کے نیک کام بہت ہیں۔ (یہ نام لکسن
 سے لیا گیا ہے)

(۱۲) پادشاہ تائبؒ: آپ راد حق میں بہت ہی تیز گام بزرگ تھے۔
 (۱۳) شیخ ابوعبید اللہ جنیدیؒ: آپ بڑے نرم دل اور محترم بزرگ تھے
 (۱۴) شیخ ابوطاہر کشوفؒ:۔ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگوں میں سے تھے
 (۱۵) خواجہ حسن بھمانؒ: بڑے درویش صوفیوں میں سے تھے
 (۱۶) شیخ سہیلؒ: بڑے درویش صوفیوں میں سے تھے۔ (صفحہ ۱، پران سے حضرت
 ابو عبد اللہ داغستانی کی روایت سننے کا ذکر کیا ہے۔)

(۱۷) احمد پیر شیخ خرقانیؒ: اپنے باپ کے نیک جانشین تھے۔
 (۱۸) ادیب کمندیؒ: آپ زمانہ کے سرداروں میں ہوئے ہیں۔ اثبات ادب کے
 باب میں (صفحہ ۳۷۱) کمند نامی گاؤں میں ان سے ملاقات کا ذکر
 کیا ہے کہ آپ ۲۴ سال سے کھڑے اور غازی تہجد کے سوا کسی

وقت نہ بیٹھتے تھے۔

اکبرمان

(۱۹) خواجہ علی الحسین السیرکافیؒ: آپ وقت کے سیاح ہوئے ہیں اور آپ نے بہت اچھے سفر کئے۔

(۲۰) حکیم پیر خواجہ علیؒ: ایک نادر بزرگ ہیں۔
(۲۱) شیخ محمد بن سلمہؒ: وقت کے بزرگوں میں سے ہوئے ہیں۔

خراسان

(۲۲) شیخ مجتہد ابوالعباسؒ: آپ کا وقت خوش اور زندگی خوب تھی۔

(۲۳) خواجہ ابو جعفر محمد بن علی الحواریؒ: آپ بزرگ صوفی اور محقق ہوئے ہیں۔

(۲۴) خواجہ ابو جعفر رشیزیؒ: آپ وقت کے عزیزوں میں تھے۔

(۲۵) خواجہ محمود نیشاپوریؒ: وقت کے پیشوا تھے۔ بیانِ طریقت میں آپ کی زبان بہت اچھی تھی۔

(۲۶) شیخ محمد معشوقؒ: آپ کی زندگی اور وقت بہت اچھے تھے۔ آپ عشقِ الہی

کی چنگاری، نیک باطن اور خوش و غم رہتا تھے۔

(۲۷) خواجہ رشید مظفر پیر شیخ ابوسعیدؒ: امید ہے آپ قوم کے پیشوا اور دلوں کا

قید ہوں گے!

(۲۸) خواجہ احمد حمادی سرخیؒ: آپ وقت کے مرد میدان ہوئے ہیں اور ایک مدت تک

میرے رفیق رہے ہیں۔ میں نے آپ کی بہت سی عجیب باتیں دیکھی ہیں۔

آپ صوفی جوان مردوں میں سے ایک ہیں۔ آگے چل کر ایشان

کے باب (صفحہ ۲۰۴) میں ان کی توبہ کی ابتدا کا قصہ لکھا ہے۔ نکاح اور

تجدید کے باب (صفحہ ۱۳۴) میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔

(۲۹) شیخ احمد بن محمد بن قندی: جو مرو میں مقیم تھے اور اپنے زمانہ کے شاہ تصوف تھے۔

(۳۰) شیخ ابوالحسن علی بن ابی طالب علی الاسود: آپ اپنے باپ کے سچے جانشین —

علوہمت اور صدق فراست میں اپنے زمانہ میں یگانہ تھے۔

داتا صاحبؒ یہاں وضاحت فرماتے ہیں کہ انھوں نے صرف خراسان میں تین سوصوفی

ایسے دیکھے ہیں جو خاص مشرب رکھتے تھے اور ان میں سے ہر ایک پورے زمانہ کے لئے

کافی تھا۔

ماوراء النہر

(۳۱) ابو جعفر محمد بن حسین الحمزی: آپ کلمات حق سننے والے اور محبت حق میں گرفتار

مرد تھے، آپ کی ہمت عالی اور وقت ضايع تھا۔ درگاہ حق کے

طالبان پر کامل شفقت رکھتے تھے۔

(۳۲) خواجہ ابو محمد بالغزی: اپنے اصحاب میں نہایت باعزت تھے۔ آپ کا حال بہت

اچھا اور معاملات بہت قوی تھے۔ روزہ کی حقیقت میں (صفحہ ۳۵۶)

انہیں دشمن ابو محمد بالغزی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے انتقال

کے وقت وہاں موجود تھے۔ اور انھوں نے ۸۰ دن سے کچھ نہ کھایا

تھا اور کسی نماز میں بھی جماعت فوت نہ ہوئی تھی۔

(۳۳) احمد الملاقی: شیخ وقت، زمانہ کے بزرگ اور رسوم و عادات کے تارک تھے۔

(۳۴) خواجہ عارف: اپنے وقت میں یگانہ اور اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے۔

(۳۵) علی بن اسحاق: اپنے زمانہ کے سردار اور باثمت بزرگ تھے۔ آپ کی زبان بہت

اچھی تھی۔

غزنی

(۳۶) شیخ عارف ابو الفضل بن الاسدی: اپنے زمانہ میں صاحب انصاف اور بڑے بزرگ رہنما ہوئے ہیں۔ آپ کی دلیلیں ظاہر ہیں اور آپ کی کرامتیں روشن ہیں۔ آپ آتش محبت الہی کا ایک شعلہ تھے۔ آپ اپنے زمانہ میں بالکل گناہ تھے۔

(۳۷) شیخ اسماعیل الشاشی: آپ دنیا سے کنارہ کش اور باحتمت رہنما تھے اور سلامتی کے طریق پر چلتے تھے۔

(۳۸) شیخ سالار ہبیری: آپ صوفی علماء میں سے تھے اور طریقت میں بہت اچھے حال کے مالک تھے۔

(۳۹) شیخ ابو عبد اللہ محمد بن عبد الحکیم المعروف بمرید: آپ بڑے ہوشیار، اسرار کے معدن اور درگاہ حق کے مستوں میں سے تھے اور طریقت میں ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ کا حال لوگوں سے پوشیدہ تھا۔ آپ کی دلیلیں ظاہر اور کرامتیں روشن ہیں۔

(۴۰) شیخ سعید بن ابی سعید العیاری: سب سے زیادہ محترم بزرگ ہیں۔ آپ حدیث کے حافظ تھے۔ عمر بہت طویل پائی تھی اور بہت سے مشائخ کو دیکھا تھا۔ آپ قوی حال کے خلیفہ بزرگ تھے۔ اپنا بھید کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔

(۴۱) خواجہ بزرگوار ابو ہسار عبد الرحیم بن احمد السعدی: آپ حرمت اور وقار کی بنیاد، قوم کے عزیز اور وقت کے سردار تھے۔ میرا دل آپ سے بہت خوش ہے۔ آپ کا وقت مہذب اور حال اچھا تھا اور تمام علوم سے واقف تھے۔

(۴۲) شیخ اوحد قسورۃ بن محمد الجردیزی (گردیزی) : اہل طریقت سے پوری شفقت رکھتے ہیں۔ اور ہر ایک کے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے۔ آپ نے بہت سے مشائخ کو دیکھا ہے۔ (ان کی اولاد ملتان میں آباد ہے)

اس فہرست میں ایسے کئی بزرگوں کے نام شامل نہیں جن سے داتا صاحب کی ملاقات رہی تھی اور جن کا ذکر کشف المحجوب میں مختلف جگہوں پر آیا ہے۔ ہم انہیں یکجا کئے دیتے ہیں !

(۱۱) پیر عبد اللہ انصاری ہروئی کا یہ قول صفحہ ۲۶ پر لکھا ہے کہ :

”ہمارا علم ابدی ہے کیونکہ نہ تو ہماری ہمت کبھی مقصود کو پاتی ہے اور نہ دنیا و آخرت میں ہماری کفایت فنا ہوتی ہے۔“

یہ بزرگ داتا صاحب کے ہم عصر تھے اور طبقات الصوفیہ انہی کی کاوش کا نتیجہ ہے جسے مولانا جامی نے ”نفحات الانس“ کے نام سے از سر نو مدون کیا اور اس میں اضافے کئے۔ حضرت انصاری کا انتقال ۸۱۴ھ / ۱۰۸۸ء میں ہوا۔

(۱۲) حضرت ابو مسلم فارس بن غالب : داتا صاحب نے فارس کے صوفیاء میں جن ابو مسلم ہروی کا ذکر کیا ہے وہ غالباً یہی بزرگ ہیں۔ صفحات ۱۶۲ اور ۸۸-۳۸۶ پر ان کی زبانی شیخ ابوسعید سے جھگڑے کا قصہ لکھا ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۳۵۱ پر شیخ ابو مسلم سے ان کے کٹ جانے کا واقعہ لکھا ہے اور پھر صفحہ ۴۶۶ پر شیخ ابو مسلم کی زبانی سماع کے بارے میں دو روایتیں رقم کی ہیں۔

(۱۳) امام غزالی : سے سرخس میں ان کے بچپن کا ایک واقعہ سن کر صفحہ ۲۴۴ پر لکھا ہے۔

(۱۴) باب عمر : فرغانہ میں ان سے ملاقات کا حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ وہ میری توبہ کے دن سے نظر شفقت فرما رہے تھے۔ (صفحہ ۵۶-۱۲۵۵)

(۵) کشف المحجوب میں دلی کی تشریح میں استاد ابوالسحق اسفرائینی کی یہ رائے لکھی ہے۔

(صفحہ ۲۳۰) کہ دلی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا،

(۶) اسی صفحے پر استاد ابوبکر بن فورک کی یہ رائے لکھی ہے کہ دلی خود کو پہچانتا ہے۔ داتا

صاحب نے ان دونوں بزرگوں کو استاد لکھا ہے جس سے خیال گزرتا ہے کہ داتا

صاحب نے ان سے ملاقاتیں کی ہوں گی اور ان سے مسائل سیکھے ہوں گے۔ باسورۃ

ان دونوں کو مسعود غزنوی کے ممتاز علماء مہتا ہے۔

یہ بھتے داتا صاحب کے معاصرین — اور ان سے خود داتا صاحب کے مرتبہ کا

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔



افکار و نظریات

✓ کشف المحجوب کے انگریزی ترجمہ کے پیش لفظ میں رینالڈ اسے نکلسن نے داماد صاحب کے عقائد اور کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ نے سنی اور حنفی ہونے کے باوجود اپنے زمانے سے پہلے اور بعد کے بہت سے صوفیوں کی طرح علم دین اور اعلیٰ درجے کے تصوف میں ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔ جس میں نظریہ فنا کو اہم مقام حاصل ہے۔ لیکن داماد صاحب کم ہی اس انتہا تک گئے ہیں کہ انہیں وحد وجودی کہنے کا جواز مل سکے۔ آپ اپنے مرشد المختلٰیؒ سے اس باب میں متفق ہیں کہ جنیدؒ کے نظریہ معبود کو سکر پر فوقیت حاصل ہے۔ آپ قارئین کو کبشرا اور بڑے زور کیساتھ تنبیہ کرتے ہیں کہ کوئی صوفی کتنے ہی بلند درجات تک کیوں نہ پہنچ جائے شریعت کی پابندی سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

نکلسن نے سماع اور احوال کے بارے میں اپنی بے جواز رائے پیش کرنے کے بعد اعتراف کیا ہے کہ :

”یہ امر واضح ہے کہ داماد صاحب تصوف کو اسلام کی حقیقی تعبیر قرار دینے میں بڑے بے تاب دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی اتنی ہی یقینی ہے کہ ان کی تشریح و توجیہ متن کتاب سے مطابقت نہیں رکھتی۔“

نگلسن نے اس مفروضہ عدم مطابقت کے ثبوت میں حاشیے میں لکھا ہے کہ :

”مصنف نے مزید کے ظاہر کی بے حقیقتی پر اپنے نظریات بڑی

دلیری کے ساتھ حج کے باب میں پیش کئے ہیں !

نگلسن کی کم فہمی پر تعجب نہ ہونا چاہیے — وہ بہر حال تثلیثی ہے موجد نہیں — اسکی

یہ رائے بھی نظر انداز کر دینے کے لائق ہے کہ :

”الچویری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خراج عقیدت پیش کیا

ہے اس کے باوجود تعلیمات عجمی بنیادی اصولوں کے سلسلہ میں انہیں

ان کے بڑے اور چھوٹے معاصرین ابو سعید بن اخیسر اور

عبداللہ انصاری سے علیحدہ نہیں کر سکتے !

اگر نگلسن یہ کہنا چاہتا ہے کہ داماد صاحبؒ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت

رکھتے تھے مگر حضرت ابو سعیدؒ اور حضرت ابو عبداللہ انصاریؒ نہیں رکھتے تھے — تو یہ

خیال کم فہمی سے زیادہ کچھ فہمی کے ذیل میں آئے گا۔

۱۔ کشف المحجوب کو جو چیز تصوف کی سابقہ کتابوں سے ممتاز

کرتی ہے — وہ داماد صاحب کا محققانہ اور مجتہدانہ انداز تحریر ہے

آپ مباحث سوک پر رد و قدح میں بھی تامل نہیں کرتے اور

منتقدین کی آراء کے ساتھ یا ان کے خلاف واضح طور پر اپنی

رائے بھی پیش کرتے ہیں۔ دو کتابوں کے سرورق کے باعث داماد

صاحب نے اپنی رائے بیان کرتے وقت اپنا نام لکھنے کی رسم قائم

کی ہے۔ اس کا مندرجہ وہی لطف ہے جو نظم میں تخلص کا

ہوتا ہے۔ ان آراء کو یکجا کر دیا جائے تو داماد صاحبؒ کے افکار

نظریات کی نہایت واضح تصویر ابھرتی ہے کم ذیل میں ہم :

ان تمام مباحث کو جن پر داتا صاحب نے طبع آزمائی کی ہے
مختلف عنوانوں کے تحت یکجا پیش کرتے ہیں:

علم و عمل

داتا صاحبؒ نے کشف المحجوب کے پہلے باب کا آغاز "ثبوت علم" کی بحث سے کیا
ہے۔ قرآن و حدیث کے ذریعے علم حاصل کرنے کی فرضیت ثابت کرنے کے بعد لکھتے
ہیں:۔

"یہ جان لو کہ علوم بہت ہیں اور انسان کی عمر محدودی ہے اس لئے
تمام علوم اور فنون کا سیکھنا انسان پر فرض نہیں مثلاً علوم
نجوم، حساب، طب اور علم بدیع کی تمام صناعات بدائع وغیرہ
کا پڑھنا کوئی ضروری نہیں۔ البتہ نجوم کا سیکھنا اس قدر
ضروری ہے جس سے رات میں اوقات نماز معلوم ہو سکیں۔
علم طب اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بیماری سے بچنے کے لئے
درکار ہے۔ اسی طرح دراشت اور دیگر امور کو سمجھنے کے لئے
علم فقہ۔ غرضیکہ علم کا سیکھنا اس قدر فرض ہے جس سے
عمل درست ہو۔"

میں نے عوام کا ایک گروہ دیکھا ہے جو علم کو عمل پر فضیلت
دیتا ہے اور دوسرا گروہ عمل کو علم پر فوقیت دیتا ہے لیکن یہ
دونوں امر باطل ہیں۔ اس لئے کہ علم کے بغیر عمل، عمل نہیں
ہوتا۔ بلکہ عمل اسی وقت عمل ہوتا ہے جب علم اس کے ساتھ
شامل ہو اور جو لوگ علم پر عمل کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ بھی غلط

ہیں۔ کیونکہ عمل کے بغیر علم کو علم نہیں کہہ سکتے اگر عالم کا علم اس کے قول و فعل سے کوئی تعلق نہ رکھے تو اس میں کچھ بھی ثواب نہیں۔
 ”لوگوں کا ایک گروہ ہے جو علماء کو علم کی بدولت بلند مرتبہ سمجھتا ہے اور ان کے اعمال کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا۔ وہ علم کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس وجہ سے عمل کو علم سے جدا کرتے ہیں۔ یہ لوگ نہ علم رکھتے ہیں نہ عمل ہی کرتے ہیں۔ اور جو لوگ علم سے مرتبہ اور دنیا کی عزت طلب کرتے ہیں وہ عالم نہیں ہوتے کیونکہ مرتبہ اور دنیا کی عزت جہالت کے لوازم میں سے ہیں۔“

اس کے بعد داتا صاحبؒ نے بتایا ہے کہ علم دو قسم کا ہوتا ہے ایک علم الہی اور دوسرا علم مخلوق۔ پھر وضاحت کی ہے کہ انسان کو جس علم کی ضرورت ہے وہ آموز الہی اور خدا کی معرفت کا علم ہے۔ انسان پر مصلحت وقت کا علم بھی ضروری ہے اور جو علم بوقت ضرورت انسان کے کام آتا ہے۔ اس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ علم شرط کا ظاہر معاملات دینی کو عمل میں لانا ہے اور اس کا باطن نیت کا صحیح کرنا۔ ان میں سے ہر ایک کا قیام دوسری قسم کے بغیر محال ہے۔

طریقیت اور شریعت

داتا صاحب کے نزدیک طریقیت و شریعت لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں:-

”طریقیت کا ظاہر باطن کے بغیر منافقت ہے اور باطن بغیر ظاہر بے دینی ہے۔“

پس علم حقیقت (طریقیت) کے تین رکن ہیں:

(۱) ذات الہی، اس کی وحدانیت اور اس سے تشبیہ کی نفی کا علم

(۲) صفات الہی اور اس کے احکام کا علم۔ اور

(۳) افعال الہی اور ان کی حکمت کا علم۔

اسی طرح شریعت کے علم کے بھی تین ارکان ہیں :

(۱) علم کتاب الہی (۲) علم سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور

(۳) علم اجماع امت ۔

پھر ان کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — علم ذات الہی کی شرط یہ ہے کہ عاقل بالغ انسان یہ اچھی طرح جان لے کہ اللہ ہمیشہ سے تھا ، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا — وہ کسی خاص مکان اور جہت میں نہیں — اس کی ذات نقص سے پاک ہے ۔ مخلوق میں اس کی مانند کوئی نہیں — جو کچھ تمہارے وہم و عقل میں متصور ہوتا ہے وہ ان سب کا پیدا کرنے والا ہے ۔ صفات الہی کو جاننے کی شرط یہ ہے کہ اس کی صفات اس کی ذات کے ساتھ موجود ہیں — نہ عین ذات ہیں اور نہ ہی غیر اور اس سے جدا ہیں ۔

افعال الہی کا علم یہ ہے کہ تم جانو کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات اور ان کے افعال کا پیدا کرنے والا ہے اور تمام عالم اس کے حکم سے عدم سے وجود میں آیا — وہ خیر و شر کا اندازہ کرنے والا اور نفع و ضرر کا خالق ہے ۔ اس کے بعد شریعت کے احکام کے اثبات کی دلیل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہمارے پاس اس کے رسول حنّاق عادت معجزات لے کر آئے ہیں اور جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوشیدہ اور ظاہر امور کے متعلق خبر دی ہے وہ حق ہے ۔ شریعت کا رکن اول کتاب الہی ہے ، دوسرا رکن سنت نبوی ہے اور تیسرا رکن اجماع امت ہے ۔

اسی ضمن میں فرماتے ہیں :

" علم من اللہ علم شریعت ہے اور علم مع اللہ طرق حق اور

قرب الہی کے مقامات اور اولیاء کے درجات بیان کرنے

کا علم ہے پس معرفت الہی شریعت کو قبول کئے بغیر صحیح نہیں ہو سکتی "

اگے ایک مقام پر لکھتے ہیں :
 "شریعت حقیقت کی اصل ہے۔ تمام ادا و نواہی کی پیروی شریعت
 ہے جو حقیقت تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔"

فرقہ حلوبیہ کے بنیان میں لکھتے ہیں :

"میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا کہ فارس اور
 ابو حلمان کون ہوئے ہیں اور انہوں نے کیا کہا ہے ؛ جو شخص ایسے
 اقوال کا قائل ہو جو توحید الہی اور تحقیق کے خلاف ہیں تو اس کو
 دین میں کچھ حصہ نہیں۔ کیونکہ جب دین جو اصل ہے
 مضبوط نہ ہو تو تصوف جو اس دین کی ذرا اور نتیجہ ہے
 اس میں زیادہ خلل ہوگا۔"

اصطلاحات صوفیہ کے باب میں لکھتے ہیں :

"شریعت بندہ کا فعل ہے اور حقیقت خداوند تعالیٰ کی نگہبانی۔
 پس شریعت کا قائم کرنا حقیقت کے وجود کے بغیر محال
 ہے اور حقیقت کا قائم کرنا۔ شریعت کی حفاظت کے
 بغیر محال ہے۔ غرضیکہ شریعت بغیر حقیقت کے ریا
 ہے اور حقیقت بغیر شریعت کے منافقت ہے۔"

مجاہدہ و مشاہدہ

اس باب میں داتا صاحب نے دو نظریات بیان کئے ہیں : ایک یہ کہ مجاہدہ —
 مشاہدہ حق کی علت ہے اور دوسرا یہ کہ حق تک پہنچنے کی کوئی علت نہیں کیونکہ جو بھی
 حق تعالیٰ تک پہنچا وہ اس کے فضل سے پہنچا اور اس کے فضل کو بندہ کے افعال

سے کیا کام؟ اس لئے محال ہے کہ مجاہدہ مشاہدہ کی عظمت ہو۔ وانا صاحب اس اختلاف کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں :

” یس علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ یہ اختلافات صرف عبارات میں ہیں معنی میں نہیں۔ اس لئے کہ ایک تو کہتا ہے کہ جس نے ڈھونڈا پالیا۔ اور دوسرا کہتا ہے جس نے پالیا طلب کیا ایک تو مجاہدہ کرتا ہے کہ مشاہدہ پالے اور دوسرا مشاہدہ کرتا ہے کہ مجاہدہ پالے۔ اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ مجاہدہ مشاہدہ کے لئے بالکل ویسا ہی ہے جیسا عبادت کے لئے توفیق اور بخشش الہی۔ پس جیسے بلا توفیق الہی بندگی کا حاصل ہونا محال ہے ویسے ہی بندگی کے بغیر توفیق کا حاصل ہونا بھی محال ہے اور جس طرح مشاہدہ بغیر مجاہدہ کے حاصل نہیں ہوتا اسی طرح مجاہدہ بھی بغیر مشاہدہ کے محال ہے۔“

فلی کون ہوتا ہے؟

وانا صاحب نے لکھا ہے:-

” جانتا چاہیے کہ تصوف و طریق معرفت کی بنیاد دراصل اصول ولایت اور اس کے ثبوت کرنے پر قائم ہے اور تمام مشائخ اس کے اثبات میں گومتفق ہیں۔ تاہم ہر ایک نے ولایت کا مفہوم مختلف عبارات میں بیان کیا ہے۔“

اس کے بعد ولی کے لغوی معنوں پر روشنی ڈالنے کے بعد مختلف مشائخ کے اقوال پیش کئے ہیں اور پھر اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کی ہے :

”میری مراد ولایت اور اس کے ثابت کرنے سے یہ ہے کہ تم جان لو کہ ولی کا نام صرف اس شخص کے لئے جاتے ہیں جس میں ولی کے اوصاف موجود ہوں۔ وہ ظاہر و باطن میں اللہ تعالیٰ کا دوست اور اللہ کے جملہ احکام کا پابند ہو۔“
اگے چل کر فرماتے ہیں :-

”ولی وہ ہیں جن کا مقصود اللہ کے سوا اور کچھ نہیں اور نہ اس کے سوا ان کو کسی اہد سے انس ہے۔ ہم سے پہلے زمانوں میں ولی ہوئے ہیں، اب بھی ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گے، اس لئے کہ خدا نے اس امت کو تمام سابقہ امتوں پر شرف عطا فرمایا کہ یہ ذمہ لیا ہے کہ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ محفوظ رکھیں گے۔“
اس بحث کے اخیر میں لکھتے ہیں :

”محدثین کے ایک گروہ نے، اللہ ان پر لعنت کرے۔ اس بزرگ طریق یعنی تصوف سے تعلق پیدا کر لیا ہے اور کہتے ہیں کہ ریاضت و مجاہدہ اتنا چاہیے کہ بالآخر بندہ ولی ہو جائے اور جب وہ ولی ہو گیا تو عمل کی ضرورت نہ رہی۔ یہ کھلی گمراہی ہے۔ حق تعالیٰ کے راستہ میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں شریعت کے ارکان میں سے کوئی رکن اٹھ جائے اور اس کی ضرورت باقی نہ رہے۔“

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں :

یاد رکھو ولایت میں سنت نبویؐ کی پیروی لازمی ہے۔“

ایمان

دانا صاحب ایمان کے بارے میں قرآن اور حدیث کی اسناد پیش کرنے کے بعد مختلف مکاتب فکر کے خیالات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

” معتزلہ تمام عبادات علمی و عملی کو ایمان کہتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ بندہ کو گناہ کبیرہ کے سبب خارج از ایمان جانتے ہیں خارجیوں کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ وہ بندہ کو گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں — اسی طرح ایک اور گروہ ایمان کو صرف قول کہتا ہے۔ ایک اور گروہ صرف معرفت کو ایمان کہتا ہے۔“

ان مختلف آراء پر بحث کے بعد اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :-

” ایمان حقیقت میں بندے کے کل اوصاف کا طلب حق میں مستغرق ہو جانا ہے اور سب طالبان حق کو اس بات پر اتفاق کرنا چاہیے کہ معرفت کے سلطان کا غلبہ ناشناسی کے اوصاف کو مغلوب کرنے والا ہوتا ہے اور جہاں ایمان ہو وہاں سے ناشناسی کے اسباب دور ہو جاتے ہیں۔“

طہارت

دانا صاحب لکھتے ہیں :

” ایمان لانے کے بعد سب سے پہلی چیز جو بندہ پر فرض ہے وہ نماز ادا کرنے کے لئے طہارت ہے۔“

طہارت کے احکام بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

”طہارت دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو جسم کی طہارت اور دوسری

دل کی جس طرح بدنی طہارت کے بغیر نماز درست نہیں ہو

سکتی اسی طرح دلی طہارت کے بغیر معرفت حق درست نہیں

ہوتی۔ بدنی طہارت کے لئے خالص پانی کی ضرورت ہے اور

دل کی طہارت کے لئے خالص توحید الہی درکار ہے خلط ط

اور پریشان اعتقاد درکار نہیں۔“

اس کے بعد وضو کے صوفیانہ معنی بیان فرماتے ہیں :

”ظاہر کی طہارت باطن کی طہارت کے موافق ہونی چاہئے۔ یعنی

جب ہاتھ دھوئے تو چاہیئے کہ دل سے بھی دنیا کی محبت کو

دھو ڈالے۔ جب استنجا کرے تو ظاہری نجاست کی طرح باطن کے

غیر اللہ کی نجاست بھی صاف کر دے۔ جب منہ میں پانی

ڈالے تو چاہیئے کہ منہ کو غیر اللہ کے ذکر سے خالی کر دے، اور

جب ناک میں پانی ڈالے تو چاہیئے کہ ناخائز چیزوں کے

سونگھنے کو اپنے اوپر حرام کر لے اور جب منہ دھوئے، تو

چاہیئے کہ تمام مرغوبات نفس سے یک لخت اراض کر لے

اور حق تعالیٰ کی طرف توجہ کرے۔ جب بازوؤں کو دھوئے

تو چاہیئے کہ تمام دنیاوی لذتوں سے ہاتھ اٹھا لے اور جب

سر کا مسح کرے تو چاہیئے کہ اپنے تمام امور کو خدا تعالیٰ کے

سپردہ کر دے اور جب پاؤں دھوئے تو چاہیئے کہ سوائے

موافق حکیم الہی کے کھڑا نہ ہو۔ اس طرح دونوں طہارتیں حاصل

ہو جائیں گی کیونکہ شریعت کے تمام ظاہری کام باطن کے امور سے وابستہ ہیں جیسا کہ ایمان میں بظاہر تو زبان سے اقرار کیا جاتا ہے لیکن یہ دل کی تصدیق سے وابستہ ہے اور شریعت میں بندگی کے احکام ظاہر بدن پر دل کی نیت کے ساتھ مربوط ہیں — پس دل کی طہارت کا طریقہ دنیا کی حیرانی میں تدبیر اور تفکر کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ دنیا ایک بے وفا جگہ ہے اور فنا کا مقام ہے لہذا دل کو اس سے خالی کر دے اور یہ بات سخت مجاہدہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی — اور سب سے ضروری مجاہدہ ظاہر کے آداب کی حفاظت کرنا اور سب احوال میں ان پر مداومت کرنا ^{سکتا}

توبہ

”ظاہر کی طہارت پانی سے ہوتی ہے اور باطن کی طہارت توبہ کرنے اور خدا تعالیٰ کی جناب میں رجوع سے۔“

پھر توبہ کے باب میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بیان کرنے کرنے کے بعد معتزلہ اور خارجیوں کے اس عقیدہ کی تردید فرماتے ہیں کہ گناہ سے سلمان کافر ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں :

”اہل سنت و جماعت اور تمام مشائخ معرفت کے نزدیک یہ بات روا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گناہ سے توبہ کرے لیکن دوسرے گناہ کرتا رہے تو خدا تعالیٰ اس ایک گناہ سے باز رہنے کا ثواب اسے دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ایک گناہ سے توبہ کی برکت سے وہ دوسرے گناہوں سے بھی باز آجائے“

نماز

نماز کے بارے میں احکام شریعت بیان کرنے کے بعد نماز کے لغوی معنوں پر بحث کی ہے اور پھر اس کے صوفیانہ معنی یہ بیان فرمائے ہیں :

”اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ پانچ وقت پانچ نمازیں ادا کرو۔ نماز میں داخل ہونے کی کچھ شرطیں ہیں۔ پہلی ان میں سے جسم کی طہارت ہے جو ظاہر میں نجاست سے اور باطن میں خواہش نفسانی سے پاک ہونا ہے۔ دوسری لباس کی طہارت ہے جو ظاہر میں نجاست سے اور باطن میں مال حرام سے نجاست حاصل کرنا ہے۔ تیسری مکان کی طہارت ہے جو ظاہر میں نجاست اور باطن میں فساد اور گناہ سے بچنا ہے۔ چوتھی قبہ رو ہونا ہے، قبہ ظاہر کا کعبہ شریف اور باطن کا عرش معلّٰی اور مشاہدہ ستر ہے۔ پانچویں شرط قیام ہے، قیام ظاہر یہ ہے کہ وقت درست ہو اور قیام باطن یہ ہے کہ حقیقت کے درجہ میں اس کا وقت ہمیشہ ہے۔ چھٹی شرط حق تعالیٰ کی طرف توجہ کر کے خالص نیت کرنا ہے۔ ساتویں ہیبت الہی اور فنا کے مقام میں تکبیر پڑھنا اور وصل کے محل میں قیام کرنا اور نہایت ترتیل کے ساتھ قرأت کرنا اور گڑا گڑا کر رکوع اور عاجزی سے سجود اور دل جمعی کے ساتھ تشہد اور صفت کے فنا ہونے کے ساتھ سلام دینا ہے“

اس کے بعد اہل طریقت کے لئے نماز کا فائدہ یہ بتایا ہے کہ :

”جانتا چاہیے کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے کہ طالبانِ ابتداء سے انتہا تک اسی سے راہِ حق پاتے ہیں اور اسی میں ہمیشہ مشغول ہوتے ہیں اور ان کے مقامات عموماً اس میں کشف ہوتے ہیں۔“

اس کے بعد نماز کے بارے میں دو مکاتیب فکر کی آراء پیش کرتے ہیں کہ ایک کے نزدیک نماز دربارِ حق میں حاضری کا ذریعہ ہے اور دوسرے کے نزدیک نماز اپنے آپ سے غائب ہونے (غیبت) کا ذریعہ ہے۔ لیکن :

”یہ علی بن عثمان جلانی کہتا ہوں کہ نماز حکیم الہی ہے۔ یہ نہ تو حاضری کا ذریعہ ہے نہ غیبت کا، کیونکہ امرِ الہی کسی چیز کا آلہ نہیں ہو سکتا۔“

بعد ازاں نماز کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مشائخ طریقت کے اقوال و اعمال بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

”صوفیاء کرام سے بعض لوگ فرائض کو تو ظاہر طور پر ادا کرتے ہیں اور نوافل کو مخفی طور پر۔۔۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ دیا سے چھپوٹ جائیں کیونکہ جب کوئی شخص عمل میں دکھلا دے کہ وہ خلقت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے۔ سو وہ ریاکار ہوتا ہے۔ دوسرا اگر وہ فرائض و نوافل سب کو ظاہر میں ادا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ریا باطل ہے اور عبادت حق ہے ہم باطل کی خاطر حق کو کیوں چھپائیں؟“

و اما صاحب اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”پس ریا کو دل سے نکال دو اور جہاں جیسے چاہو عبادت کرو“
پھر ایک بزرگ کے قول کے ذریعے واضح کرتے ہیں کہ مناز باجماعت پڑھی جائے
اور جمعہ کسی جامع مسجد میں! ^{۱۵}

محبت الہی

داتا صاحب کے زمانہ تک تصوف کو دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور
خوف الہی اور عذاب کے خوف کا تھا۔ دوسرا دور محبت الہی کا تھا۔ ڈاکٹر علی حسن
عبدالقادر نے اپنی تصنیف ”جنید بغداد“ میں اس موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔
داتا صاحب جنیدی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے مرشد حضرت ختلی تھے۔ جو
حضرت حصری کے مرید اور رازدان تھے۔ اور حضرت حصری حضرت شبلی کے مرید تھے جو
حضرت جنید کے قابل ذکر شاگرد تھے۔ ^{۱۶}

محبت الہی کا فلسفہ بعض لوگوں کو وحدت الوجود کے نظریہ میں لے گیا تھا اور اس کے
رد عمل کے طور پر بعض لوگوں نے یہ قرار دیا تھا کہ اللہ کی محبت بندہ کے لئے اور بندہ
کی محبت اللہ کے لئے جائز ہی نہیں۔ داتا صاحب تصوف کے کسی مکتبہ میں بھی انتہا
کو پسند نہیں فرماتے اور اس خاص موضوع پر بحث کرنے سے پہلے انھوں نے محبت
الہی کے ثبوت میں قرآن و حدیث کی اسناد پیش کی ہیں۔ پھر لفظ محبت کے لغوی معنی
پر بحث کی ہے اور اس ضمن میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔

”حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت بندہ کے لئے یہ ہے
کہ اس پر نعمت زیادہ کرتا ہے۔ دنیا و عقبیٰ میں اس کو ثواب
دیتا ہے۔ عذاب سے اس کو محفوظ رکھتا ہے اور گناہ سے اس کو
بچاتا ہے۔ بلند احوال اور اچھے مقامات اس کو کرامت فرماتا

ہے۔ اس کے باطن کو اغیار کی طرف توجہ کرنے سے ہٹا دیتا ہے اور اپنی ازلی عنایت سے اسے سرفراز کرتا ہے تاکہ وہ سب سے جدا ہو کر اس کی رضا کی طلب کے لئے تنہا رہ جائے اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو ان امور سے مخصوص کر لیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے اس مخصوص ارادہ کو محبت کا نام دیا جاتا ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ :

”بندہ کی محبت اللہ تعالیٰ کے لئے ایک صفت ہے۔ جو فرماں بردار مومن کے دل میں تعظیم، تکبیر اور تکریم کے معنی میں پیدا ہوتی ہے تاکہ وہ محبوب برحق کی رضا طلب کرے اور اس کے ذکر کا عادی ہو، اس کے سوا غیر کے ذکر سے میزار ہو اور اس کے حکم پر گردن جھکا دے“

اس کے بعد اس موضوع پر مشائخ کے اقوال پیش کر کے شریعت کے مکمل اتباع کی ہدایت کی ہے۔

زکوٰۃ

اس باب میں داتا صاحب لکھتے ہیں :

”زکوٰۃ اسلام کے ارکان و فرائض میں سے ہے اور نعمت کے

پورا ہونے پر واجب ہوتی“

نصاب زکوٰۃ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

”یاد رکھو کہ جس طرح مال پر زکوٰۃ فرض ہے اسی طرح مرتبہ

پر بھی زکوٰۃ فرض ہے کیونکہ وہ بھی پوری نعمت ہے۔ مرتبہ کی

زکوٰۃ یہ ہے کہ اگر حاکم ہو تو انصاف کرے۔ عالم و مفتی ہو تو
سفاہش و رعایت اور اخلاص سے مسائل حق بیان کرے
اور اسی طرح باطن کی نعمت کی بھی زکوٰۃ سے اور وہ یہ ہے کہ
حق تعالیٰ کی نعمت کا بے شمار شکر ادا کرے^{۱۹}۔

روزہ

روزہ کی فرضیت کے بارے میں قرآن و حدیث کی اسناد پیش کرنے کے بعد روزہ
کی صوفیانہ تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”یاد رکھو کہ نفس کو روکنے کی بہت سی شرطیں ہیں : مثلاً
پیٹ کو کھانے سے اور پینے سے بچائے ، آنکھ کو نظرِ شہوت
سے ، کان کو غیبت سننے سے ، زبان کو لغو اور بے ہودہ باتوں
سے اور جسم کو دنیا کی متابعت اور شریعت کی مخالفت سے
محفوظ رکھے۔ صرف اسی طرح وہ حقیقی طور پر روزہ دار ہوگا“

پس خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوا یہ فرمان رقم کیا ہے کہ :

”اپنی زبان اور دوسرے سب حواس کو بند رکھ“

اس کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں :

”پس روزہ دار کو چاہئے کہ حواسِ خمسہ کو قابو میں رکھے یہاں تک
کہ وہ حکمِ الہی کی مخالفت چھوڑ کر شریعت کی پوری طرح پیروی
کرے تاکہ صحیح معنوں میں روزہ دار کہلائے۔ روزہ صرف کھانے
پینے سے روزہ رکھنا بچوں اور بوڑھی عورتوں کا کام ہے“

حج

استطاعت رکھنے والوں پر حج کی فرضیت اور اس کی رسوم پر روشنی ڈالنے کے بعد اسکی صوفیانہ تشریح کی ہے۔ اور اس ضمن میں مشائخ کے اقوال پیش کئے ہیں اور اپنی رائے یہ دی ہے کہ :

”پس حج دو قسم کا ہوتا ہے : ایک غیبت میں دوسرا حضور میں، جو شخص حرم مکہ میں بھی پہنچ کر بھی غیبت کے اندر ہو، وہ ایسا ہی ہے جیسا اپنے گھر کے اندر ہو۔ اس لئے کہ کوئی غیبت دوسری سے بہتر نہیں۔ پس حج مشاہدہ حق کے ظہور کیلئے مجاہدہ ہے لیکن مجاہدہ مشاہدہ حق کے لئے علت نہیں بلکہ اس کا سبب ہے اور سبب کو معافی کی حقیقت میں کوئی زیادہ تاخیر نہیں ہوتی۔ الغرض حج سے مقصود خانہ کعبہ کا دیدار نہیں بلکہ اس سے مقصود مشاہدہ حق ہے۔“

دعوت و تبلیغ

صوفیاء کی گوشہ نشینی کو رہبانیت سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ واما صاحب نے کئی جگہ اس کی وضاحت کی ہے کہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دنیاوی اغراض سے منہ موڑ لیا جائے اور جب صوفی کو کمال حاصل ہو جائے تو پھر خلق خدا کی اصلاح میں مشغول ہو جائے۔ خاموشی اور گفتگو کے باب میں دو نظریات پیش کئے ہیں۔ ایک یہ کہ صوفی کے لئے خاموشی سے کلام بہتر ہے۔ اور دوسرا یہ کہ کلام سے خاموشی بہتر ہے۔ واما صاحب فرماتے ہیں۔

”میں علی بن عثمان الجحدی کہتا ہوں کہ کلام بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔“

اور سکوت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک کلام تو حق ہوتا ہے اور دوسرا باطل۔ اسی طرح ایک سکوت تو مقصد کے حاصل ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور دوسرا سکوت غفلت کی وجہ سے۔ پس بولنے یا خاموش رہنے کے وقت ہر شخص کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے۔ اگر اس کا کلام حق ہے تو اس کا بولنا خاموشی سے بہتر ہے اور اگر باطل ہے تو خاموشی ہی بہتر ہے۔
آگے لکھتے ہیں :-

”پس طریقت کی طرف دعوت دینے والے اپنے بولنے میں مامور اور مجبور ہوتے ہیں۔ اور کلام کے آداب یہ ہیں کہ بے امر الہی نہ ہو۔ اور سوائے امر حق کے کچھ نہ کہے۔ خاموشی کے آداب یہ ہیں کہ خاموش رہنے والا جاہل نہ ہو، بے جا حالت پر راضی نہ ہو اور غافل بھی نہ ہو۔“

سماح

داتا صاحب سماح کی اثر آفرینی کے قائل ہیں۔ ابتدائے حال میں سماح سے شغف رکھتے تھے لیکن آخر میں اس سے پرہیز فرمانے لگے۔ انھوں نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ :-

”سننے کے لائق چیزوں میں سے دل کے لئے فوائد کے لحاظ سے اور باطن کے لئے زوائد کے اعتبار سے اور کان کے لئے لذت کی دوسرے بہترین چیز اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔
مبطلان کو قرآن پڑھنے اور سننے کا حکم ہے۔ قرآن کے

معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اس کے پڑھنے اور
سننے سے طبیعت منور نہیں ہوتی اس سے رقت حاصل ہوتی ہے۔

داتا صاحب شعر سننے کو مباح قرار دیتے ہیں لیکن شرط یہ رکھتے ہیں کہ کلام پاکیزہ اور خیالات نیک
ہوں۔ خواہش نفس کے لئے سماع کرنے والوں کے بارے میں کہتے ہیں۔
”جاہل لوگوں نے حال میں مستغرق سماع کرنے والے صوفیوں
کو دیکھا تو کہنے لگے کہ سماع حلال ہے۔ اگر حلال نہ ہوتا تو
یہ صوفی لوگ نہ کرتے۔ چنانچہ ان جاہلوں نے ظاہر کو اختیار
کر لیا اور باطن کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ خود بھی ہلاک ہو
گئے اور ایک قوم کو بھی ہلاک کر دیا۔ یہ زمانہ کی بہت بڑی
آفت ہے۔“

مشائخ نے سماع کی اباحت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے داتا صاحب اسکی وضاحت
فرماتے ہیں کہ:-

”مشائخ صوفیاء کی مراد اباحت فقہی نہیں کہ جس پر عمل کرنا نہ کرنا برابر
ہو بلکہ ان کی مراد اس سے وہ اباحت ہے جس سے اعمال میں فوائد
حاصل ہوں۔ ویسے مباح کے درپہ ہونا عوام کا کام ہے۔ سمجھدار
لوگ فوائد کو ملحوظ رکھتے ہیں۔“
اس کے بعد لکھتے ہیں۔

”ایک دفعہ میں مرو میں تھا کہ ائمہ حدیث میں سے ایک مشہور
امام نے کہا ”میں نے سماع کی اباحت میں ایک کتاب لکھی ہے۔“
میں نے کہا ”یہ تو رہین میں بڑی مصیبت ہوئی گیونکہ امام نے
ایک لہو کو جو تمام بدکاریوں کی اصل ہے حلال کر دیا ہے۔“

انہوں نے کہا کہ اگر تو اس کو حلال نہیں سمجھتا تو سنتا کیوں ہے؟ میں نے کہا اس کی کئی وجوہ ہیں اور ان میں سے کسی ایک وجہ کو قطعی فیصلہ کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر اس کی تاثیر دل میں حلال ہے تو اس کا سماع بھی حلال ہے اور اگر حرام ہے تو سماع بھی حرام ہے اور اگر تاثیر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے ورنہ نہیں۔ اس کے بعد رکھتے ہیں مرید کا سماع کے غلبہ میں ایسا حال ہونا چاہیے کہ اس کا سماع بدکاروں کو بدکاری سے نجات دے مگر اس زمانہ میں گراموں کا ایک گروہ بدکاروں کے سماع میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم حق کی وجہ سے سماع کرتے ہیں۔ فاسق لوگ ان کی موافقت کرتے ہیں اور فسق و فجور میں زیادہ حریص ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود ہلاک ہو جاتے ہیں۔ داتا صاحب کے زمانہ میں بعض لوگوں نے سماع کے ساتھ رقص بھی اختیار کر لیا تھا۔ لیکن داتا صاحب نے اپنے مریدوں کو اس کی مکمل ممانعت فرمائی ہے کہ ”جانتا چاہیے کہ شریعت اور طریقت میں رقص کی کوئی سند موجود نہیں رقص اچھا ہو تو لہو ہوتا ہے بُری طرح کیا جاتے تو لغو ہوتا ہے۔ غرضیکہ یہ حرام محض ہے۔“ آخر میں سماع کے یہ آداب و شرائط مقرر کیے ہیں ”سماع کو عادت نہ بنایا جاتے۔ سماع کے وقت مرشد کی موجودگی ضروری ہے۔ وہاں حوام موجود نہ ہوں۔ قوال بھی شریعت کا احترام کرنے والا اور پابند دین ہو۔ دل دنیا کے دھندوں سے خالی اور طبیعت لہو و لعب سے متفر ہو۔ میں علی بن عثمان جلابی اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ مبتدیوں کو سماع کی اجازت نہ دی جاتے تاکہ ان کی طبیعت پریشان نہ ہو جاتے کیونکہ اس میں بڑے خطرے اور خرابیاں ہیں۔ اس لیے کہ عورتیں چھتوں کے اوپر سے اور مکالوں سے ان کو سماع کی حالت میں دیکھتی ہیں اور اس سے سامعین پر سخت پردے پڑ جاتے ہیں۔ چاہیے کہ جوانوں میں سے بھی کسی کو وہاں نہ بٹھائیں اس لیے کہ جاہل صوفیوں نے ان باتوں کو مذہب بنا لیا ہے اور سچائی کو درمیان سے اٹھا دیا ہے۔ میں ان باتوں سے جو اس قسم کی خرابیوں سے مجھ پر گزری ہیں استغفار کرتا ہوں۔“ ۲۳



ماخذ

باب

- ۱۔ عبدالرحمن، صباح الدین۔ "یزم صوفیہ"۔ عظیم گڑھ۔ صفحہ ۱۔ ظہیر احمد شاہ "ظہیر المطلب" اردو ترجمہ کشف المحجوب، لاہور میں سال پیدائش بغیر کسی قدر کے ۴۰۰ھ دیا گیا ہے۔ نیز اکرام آب کوثر لاہور صفحہ ۷۶
- ۲۔ جامی، نور الدین۔ نفحات الانس، کلکتہ ۱۸۵۹ء
- ۳۔ ابوالفضل، آئین اکبری، جلد ۳ صفحہ ۱۶۸
- ۴۔ مراثی القدس (قلمی) بحوالہ "مآثر لاہور، جز دوم صفحہ ۱۴
- ۵۔ دارا شکوہ، "سفینۃ الادب" اور ترجمہ نفس ایکٹھی کراچی صفحہ ۲۰۹
- ۶۔ محمد شفیع مولوی، مقالات دینی و علمی ۵ ہجری۔ صفحہ ۱۹۳
- ۷۔ حبیب محمد، "سلطان محمود آف غزنین" دہلی (۱۹۵۱) صفحہ ۵
- ۸۔ التجویری، "کشف المحجوب" نسخہ مولوی محمد شلیع، صفحہ ۱
- ۹۔ "سفینۃ الادب" ۲۰۹-۲۱۰
- ۱۰۔ ایضاً ۲۱۰
- ۱۱۔ چشتی، مولوی نور احمد "تحقیقات چشتی" لاہور (۱۸۶۷) صفحہ ۱۴۷
- ۱۲۔ دریا بادی، عبد الماجد "تصرف اسلام" عظیم گڑھ (۱۲۶) صفحہ ۴۲۔ یزدانی، ایم اے مجید گنج بخش بحیثیت عالم لاہور (۱۹۶۸) ۲۹-۳۰
- ۱۳۔ "تحقیقات چشتی" ۱۴۷
- ۱۴۔ کشف المحجوب ۶۹
- ۱۵۔ ایضاً ۷۱
- ۱۶۔ ایضاً ۷۲
- ۱۷۔ ایضاً ۷۳
- ۱۸۔ التجویری، اردو ترجمہ کشف الاسرار۔ ملک شیر محمد اعوان کالاباغ (۱۹۶۳) صفحہ ۳۶
- ۱۹۔ کشف المحجوب ۵۷
- ۲۰۔ کشف المحجوب ۲۰
- ۲۱۔ ایضاً ۴۱۵
- ۲۲۔ ایضاً ۸
- ۲۳۔ ایضاً ۱۱
- ۲۴۔ ایضاً ۲۵۵
- ۲۵۔ ایضاً ۲۸۵-۶
- ۲۶۔ ایضاً ۴۱۲

- ۲۷- ایضاً ۴۳
 ۲۸- ایضاً ۴۶
 ۲۹- ایضاً ۵-۴۴۹
 ۳۰- ایضاً ۳۸۴
 ۳۱- ایضاً ۱۵۹
 ۳۲- ایضاً ۲۴۴-۵
 ۳۳- ایضاً ۳۶۶
 ۳۴- نکلسن، انگریزی ترجمہ کشف المحجوب ۴۲۲
 ۳۵- کشف المحجوب ۹۶
 ۳۶- ایضاً ۳۴۶-۷
 ۳۷- ایضاً ۱۶
 ۳۸- ایضاً ۱۰۰
 ۳۹- ایضاً ۲۶۶
 ۴۰- سفینۃ الاولیاء ۲۱۰
 ۴۱- کشف المحجوب ۳۷۷
 ۴۲- ہاشمی سید فرید آبادی، آثار لاہور (۱۹۵۶) جزو دوم ۱۷
 ۴۳- آئین اکبری، جلد ۳- صفحہ ۱۶۸
 ۴۴- "آثار لاہور" جزو دوم ۱۵
 ۴۵- سفینۃ اولیاء، نزل کشور (۱۸۷۷) صفحہ ۱۶۵۔ اردو ترجمہ نفیس اکیڈمی نے ۱۹۵۲ء میں بنادیا ہے
 صفحہ ۲۱۰۔ نیز کشف المحجوب مقدمہ ۶
 ۴۶- حبیبی، عبدالحی، انڈین کالج میگزین لاہور، فروری-۱۹۶۶ء صفحہ ۲۸
 ۴۷- مفتی غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیاء جلد ۲- صفحہ ۲۳۴
 ۴۸- مقالات دینی و علمی حصہ اول صفحہ ۱۹۲
 ۴۹- تحقیقات حشریہ ۱۴۰
 ۵۰- مقالات دینی و علمی ۱۹۲
 ۵۱- عبدالحی سید، "زمین و آسمان" اردو ترجمہ مقبول اکیڈمی لاہور، جلد اول ۱۵۲
 ۵۲- دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۲- صفحہ ۹۲۷
 ۵۳- عبد الماجد دریا بادی، "تصوف اسلام" صفحہ ۴۹۔ لکھتے ہیں کہ دوسرے قرینے بھی اسی کی تائید میں ہیں۔
 ۵۴- بزم صوفیہ ۸
 ۵۵- آب کوثر ۷۷
 ۵۶- نکلسن، ترجمہ کشف المحجوب صفحات XI-X
 ۵۷- مقالات علمی اقل ۱۹۲-۳
 ۵۸- سالک، علم الدین، "گنج بخش" ۱۸ تا ۱۶
 ۵۹- انڈین کالج میگزین (فروری-۱۹۶۶) ۲۷ تا ۲۰
 ۶۰- ایضاً ۳۳

- ۶۱۔ ایضاً ۳۴
۶۲۔ ایضاً ۲۵
۶۳۔ ایضاً ۳۵
۶۴۔ ایضاً ۳۶
۶۵۔ ایضاً ۳۸

۶۶۔ نکلسن ترجمہ کشف المحجوب X - XI

۶۷۔ گنج بخش بحیثیت عالم ۳۰ تا ۳۵

۶۸۔ کشف المحجوب مملوکہ مولوی محمد شفیع مرحوم جسے ان کے فرزند احمد ربانی نے شائع کر دیا ہے

باب ۲

- ۱۔ تحقیقات حشری ۱۶۵-۶
۲۔ فیروز الدین مولوی بیان المطلوب ترجمہ کشف المحجوب ۱۱
۳۔ تحقیقات حشری ۱۴۱
۴۔ ایضاً ۱۴۱
۵۔ ایضاً ۱۴۲
۶۔ ایضاً ۱۴۲، ۱۴۳
۷۔ ایضاً ۱۴۷

باب ۳

۱۔ جیسے داتا صاحب کی اپنی نوٹس ہیں۔ ابو سعید عبدالحی الفخاک گردیزی کی "زمین الاخبار" کے بیشتر اجزاء۔ ابوالفضل بیہقی (۳۸۵ھ تا ۴۷۰ھ) کی تاریخ مسعودی کی کم از کم پچیس جلدیں۔ ظہیر الدین علی بن زید البیہقی (۴۹۰ھ تا ۵۶۵ھ) کی "مشارب التجارب و غرائب الغرائب" وغیرہ۔

۲۔ جلالوی۔ سبحان لائے "خلاصۃ التواریخ" اردو ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی لاہور (۱۹۶۶ء) صفحہ ۱۰۶۔

۳۔ مقالات علمی۔ اول۔ ۱۹۳-۹۴

۴۔ "رسالہ ابدالیہ" بحوالہ نکلسن و میاچہ X

۵۔ آثار لاہور۔ جزو دوم۔ ۲۲۲-۲۰

۶۔ انڈینل کالج میگزین (فروری ۱۹۶۰ء) صفحات ۳۱-۳۰

۷۔ کشف المحجوب ۲۵۶

۸۔ ایضاً ۴۷

۹۔ ایضاً ۵۴

۱۰۔ کشف المحجوب ۱۷۳

۱۱۔ مقالات علمی اول ۱۹۴

۱۲۔ آثار لاہور جزو دوم ۲۷

۱۳۔ سبزی "میر حسن" فرزند الغزالی ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور (۱۹۶۶ء) صفحہ ۵۷۔

۱۴۔ محدث، شیخ عبدالحی، دہلوی "اخبار الاخیار" اردو ترجمہ لطیف ملک لاہور (۱۹۷۱ء) ۲۱۳

۱۵۔ ایضاً ۱۰۹

۱۶۔ مآثر لاہور جز دوم ۲۴

۱۷۔ تصوف اسلام۔ ۵۱-۱۵۰

۱۸۔ مآثر لاہور جز دوم ۲۵

۱۹۔ کشف المحجوب ۱۷۳

۲۰۔ مآثر لاہور جز دوم ۲۵

۲۱۔ آئین اکبری جلد ۳۔ صفحہ ۱۶۸۔ خزینۃ الاصفیاء جلد ۲۔ صفحہ ۲۵۰۔ میر محمد لطیف نے تاریخ لاہور (انگریزی) میں ماخذ بتائے بغیر تاریخ ۳۳۱ھ لکھی ہے

۲۲۔ سفینۃ الاولیاء ۱۲۸۔ مقالات علمی اول ۲۱۵

۲۳۔ خزینۃ الاصفیاء جلد ۲۔ صفحہ ۲۵۳

۲۴۔ تحقیقات حشری۔ صفحہ ۱۳۸۔ لیکن حشری نے اس سے پہلے صفحہ پر لاہور میں درود کا سن ۵۲۵ھ لکھا ہے۔

۲۵۔ اوزن بیل کالج میگزین (فروری ۱۹۶۰) ۳۹ تا ۴۱

۲۶۔ کشف المحجوب ۹۶۔ بعض نسخوں میں "افرد یاربند" کے آگے "در بلدہ لاہور کہ از مصنفات طمان است"

کا اضافہ ملتا ہے۔ لیکن ترجمہ کشف المحجوب صفحہ ۹۱، روسی نسخے میں بھی لاہور کا ذکر متن میں نہیں حاشیہ میں کیا گیا ہے صفحہ ۳

۲۷۔ "تصوف اسلام" صفحہ ۴۹

۲۸۔ اظہر قاضی مبارکپوری "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں: نمونۃ المصنفین" ص ۱ (۱۹۶۷) ۲۵۳

۲۹۔ ندوی، ریاست علی محمد اسلامی کا ہندوستان "ادانۃ المصنفین، پٹنہ (۱۹۵۰ء) ۹۹

۳۰۔ آب کوثر ۷۵

۳۱۔ تحقیقات حشری۔ ۸-۱۹۷۔ "خزینۃ الاصفیاء جلد ۲ صفحہ ۲۳۰

۳۲۔ مآثر لاہور جز دوم ۱۰۰۹

۳۳۔ سفینۃ الاولیاء ۲۱۰

باب ۴

۱۔ "فتوح البلدان"۔ "معجم البلدان" ترجمہ: "النساب العرب" بحوالہ "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں"

صفحات ۲۵ تا ۲۷

۲۔ ایضاً ۲۴۵

۳۔ مآثر لاہور جز اول ۱۵

۴۔ البیرونی، البرہان، کتاب الہند انگریزی ترجمہ جلد اول ۲۲۷۔ فرشتہ، اردو ترجمہ لاہور ۱۲۴۔ مآثر

لاہور جز اول صفحات ۱۶-۱۷

۵۔ سلطان محمود آف غزنوی ۲۴

۶۔ کتاب الہند جلد اول ۲۷۶، ۲۷۷

۷۔ خزینۃ الادب الحرب والشجاعت۔ بحوالہ مآثر لاہور جز اول ۱۵۔ دوم ۱۷۳

۸۔ محب الحق کشمیر سلاطین کے عہد میں "اعظم گڑھ" (۱۹۶۹) صفحات ۴۰ تا ۴۲

۹۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۲۱۔ کتاب الہند جلد اول ۱۵۶

۱۰۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۲۲۲

- ۱۱۔ سلطان محمود آف غزنین ۳۴
- ۱۲۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔ ۱۰۰
- ۱۳۔ سلطان محمود آف غزنین ۴۶-۴۷
- ۱۴۔ آثار لاہور جلد اول ۲۵
- ۱۵۔ لاہور، لطیف حاشیہ صفحہ ۷۲۲
- ۱۶۔ وٹسیانا، "کام شاستر" انگریزی ترجمہ سر پرچہ ڈبرٹی۔ لندن (۱۹۲۳) ۵۸
- ۱۷۔ کتاب الہند۔ جلد اول ۳۴۸
- ۱۸۔ خلاصۃ التواریخ، جلد اول ۱۰۵
- ۱۹۔ "ڈاکٹر ایڈوانس" راجستھان لندن (۱۹۱۴) جلد اول ۱۷۶۔ نیز لاہور لطیف صفحہ ۴۰
- ۲۰۔ "تھارٹن ٹی۔ ایچ" سے بریف اکاؤنٹ آف ہسٹری اینڈ انٹیلیجنس آف لاہور (۱۸۷۳) ۱۰
- ۲۱۔ البلاذری (متوفی ۲۷۷ھ/۶۸۹ء) بحوالہ ہسٹری آف انڈیا۔ ایلیٹ اینڈ ڈائمن لندن (۱۸۷۷) جلد اول ۱۱۶
- ۲۲۔ نامعلوم، "معدنہ العالم" (لندن ۱۹۳۷) ۶۱۴
- ۲۳۔ یاقوت، "معجم البلدان بحوالہ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۲۲۵
- ۲۴۔ خان ولی اللہ خان "دی اورجن آف لاہور" پاکستان ٹائمز لاہور دس سالہ نمبر ۱
- ۲۵۔ کتاب الہند جلد اول۔ ۲۷۶-۲۷۷
- ۲۶۔ آثار لاہور جلد اول ۲۰
- ۲۷۔ خان ولی اللہ خان "دی اورجن آف لاہور"
- ۲۸۔ "پراشسی ایل" لاہور شہر" (پنجابی) ۲۶
- ۲۹۔ آثار لاہور جلد اول ۲۲
- ۳۰۔ لاہور از لطیف ۳۹۷ تا ۴۰۰
- ۳۱۔ "شیخ" "آداب الحرب والشجاعت" اورنیل کالج میگزین لاہور (نومبر ۱۹۳۷)۔ اصل کتاب ابھی تک نہیں چھپی۔ نیز آثار لاہور جلد دوم صفحات ۱۷۲ تا ۱۷۴
- ۳۲۔ کشف المحجوب نکلسن ۹۱
- ۳۳۔ کشف المحجوب ۹۶
- ۳۴۔ "سائلک علم الدین" گنج بخش بحوالہ ہزدانی ۳۲
- ۳۵۔ ۳۹۹ھ/۹-۸-۱۰۰۸ء میں قلعہ نگر کوٹ سے ۷ کروڑ درہم کے سکے۔ متر ہزار من سونا چاندی اور سونے سے درگاہ دینار کا مال ہاتھ لگا۔ اسے پرتیبھ سے ۸ لاکھ دینار کے سکوں کے علاوہ تیس ہزار دینار کے طلائی و نقرئی برتن | قدیم بحوالہ "باسورہ" دی غزنویڈ ۷۸ صفحہ ۷۸۔ نیز مرنے کے دو دن پہلے سامے خزان کا ڈھیر لگا کر دیکھا اور دہڑا۔ اگلے دن | تھپوں اور گھوڑوں کی قطاریں لگا کر دیکھیں۔ فرشتہ ۱۵۳
- ۳۶۔ غزنوی سلاطین کے عزل و نصب کی یہ مختصر داستان "فرشتہ" سلطان محمود آف غزنین: "دی غزنویڈ" ماثرہ مورخ اور تربت الخواطر سے مرتب کی گئی ہے۔ عزل و نصب کی تاریخوں کے لیے کلیتہاً مختصر دی غزنویڈ پر کیا گیا ہے۔ نیز مردم شماری رپورٹ (۱۹۱۱) انگریزی، ڈاکٹر راولپنڈی I صفحہ ۹۔
- ۳۷۔ سلطان محمود آف غزنین ۴۶-۴۷
- ۳۸۔ خلاصۃ التواریخ۔ ۱۰۵
- ۳۹۔ آثار لاہور جلد اول۔ ۲۱

- ۴۰- لاہور، لطیف ۳۹۷-۳۹۸
 ۴۱- مآثر لاہور جز اول ۲۶۴۲۵
 ۴۲- ایضاً ۳۱ تا ۳۸
 ۴۳- ایضاً ۳۱ تا ۳۲، نیز سلطان محمود آف غزنین ۹۵
 ۴۴- دی غزنویڈز ۷۶
 ۴۵- مآثر لاہور جز اول ۳۱ تا ۳۹، سلطان محمود آف غزنین ۹۶
 ۴۶- فرشتہ ۱۸۱-۱۸۲، نیز سلطان محمود آف غزنین ۱۰۳
 ۴۷- فرشتہ ۱۸۵، سلطان محمود غزنوی ۱۰۴
 ۴۸- سلطان محمود آف غزنین ۱۰۴، مآثر لاہور جز اول ۵۶
 ۴۹- ایضاً ۱۰۵-۱۰۶، ۷۶ تا ۷۵
 ۵۰- فرشتہ ۵-۱۹۴، مآثر لاہور جز اول ۷۷
 ۵۱- ایضاً ۱۹۶، ایضاً ۷۸
 ۵۲- مآثر لاہور جز اول ۷۹ تا ۱۰۵
 ۵۳- " " " " " " ۲۰۷
 ۵۴- " " " " " " جز دوم ۷۵
 ۵۵- " " " " " " ۷۶ تا ۹۶
 ۵۶- " " " " " " ۱۳۵
 ۵۷- " " " " " " جز دوم ۱۳۸ تا ۱۴۰
 ۵۸- " " " " " " جز دوم ۱۴۴
 ۵۹- " " " " " " جز اول ۱۹۰ تا ۲۰۱

باب ۵

- ۱- کشف المحجوب ۸-۲۵۷
 ۲- " " " " ۲۸۶
 ۳- کتاب الہند، جلد اول، پیش لفظ IX
 ۴- کشف المحجوب ۳۴۰
 ۵- " " " " ۴۶۵
 ۶- " " " " ۴۵۵
 ۷- البیرونی، کتاب الہند جلد اول ۲۶۱-۲۶۰
 ۸- مآثر لاہور جز دوم ۹
 ۹- مآثر لاہور جز اول ۱۶
 ۱۰- تحقیقات حشری ۱۹۸
 ۱۱- دی غزنویڈز، صفحات ۷۸-۱۱۴
 ۱۲- کشف المحجوب ۳۸۷
 ۱۳- " " " " ۲۶۶

- ۱۴- داراشکوہ- سفینۃ الاولیاء ۲۱۰
 ۱۵- کشف المحجوب ۲۰۶
 ۱۶- " " ۵۴
 ۱۷- " " ۳۸۳
 ۱۸- " " ۳۸۰
 ۱۹- " " ۲۸۲-۸۳
 ۲۰- تحقیقات حشری ۱۳۹
 ۲۱- تاثر لاہور جز دوم ۲۳
 ۲۲- کشف الاسرار و ترجمہ ملک شیر محمد اعوان- کالا باغ ۱۹۶۳ صفحات ۲۰-۳۹

باب ۶

- ۱- ایم ناظم- دی لائف اینڈ ٹرانزات سلطان محمدات غزنویہ (۱۹۳۱ء) ۱۵۶-۹
 ۲- چار مقالہ- براؤن- نظر ثانی شدہ ترجمہ ۵۳
 ۳- بیہقی ۱۴- ۵۳۹- بحوالہ بسورقہ ۱۳۷
 ۴- بسورقہ ۶۲
 ۵- چار مقالہ طبع لاہور صفحہ ۲۳- مولانا مامشی کے نزدیک صاحب چار مقالہ نے اپنے ایرانی سسرال اور شعی روایات کے زیر اثر محمود پر چھپ کر حملے کیے ہیں۔ تاثر لاہور جز اول صفحہ ۵۸ حاشیہ
 ۶- بسورقہ ۹۶
 ۷- " " ۱۲۹
 ۸- " " ۱۳۸
 ۹- " " ۷۶ اور حاشیہ ۵۹- صفحہ ۲۷۶- نیز جیب ۲۵
 ۱۰- جیب- دی سلطان محمدات غزنویہ ۸۵
 ۱۱- " " " " ۲۷
 ۱۲- البیرونی انڈیا- جلد اول ۲۶۰-۲۴
 ۱۳- بسورقہ ۷۸- ۱۰۲
 ۱۴- " " ۷۹
 ۱۵- " " ۱۱۷
 ۱۶- تاثر لاہور جز اول ۲۳۵-۹ بسورقہ ۱۱۰-۸۹
 ۱۷- پردیس سی دی دیدہ یہ ممبئی یونیورسٹی اور پروفیسر سنٹی کارچیری کلکتہ یونیورسٹی- بحوالہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک- مرتبہ صباح الدین عبدالرحمن اعظم گڑھ ۱۹۵۸- صفحات ۲۸-۷۲ نیز لطیف، ہشری آت لاہور- صفحات ۳۹۷ تا ۴۰۱- نیز بسورقہ ۲۴
 ۱۸- کشف المحجوب ۱۷۰
 ۱۹- فرشتہ ۱۵۷-۷۰
 ۲۰- بیہقی ۸- ۶۳۶- بحوالہ جیب دیاچہ VI تا IX
 ۲۱- کشف المحجوب ۲۱۳

باب ۷

۱۔ مولوی شفیع۔ مقالات علمی حصہ اول ۱۹۹

۲۔ آقائے حبیبی، ارمغان علمی لاہور ۱۹۵۵، صفحہ ۳۳

۳۔ آثار لاہور۔ جزو دوم ۵۰

۴۔ دردِ نعلی۔ مرتبہ شیخ علی محمود جاندار۔ قلمی نسخہ۔ بحوالہ مولانا دیوبادی تصوف اسلام۔ صفحہ ۵۲

۵۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی ترجمہ ڈاکٹر سید معین الحق مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۹

۶۔ بزم صوفیہ۔ صفحہ ۱۰

۷۔ لغات الاقش ۳۵۸

۸۔ سفینۃ الاولیاء ۴۱۰

۹۔ کشف المحجوب ۸۰-۳۷۹

۱۰۔ ۳۸۳

۱۱۔ مکمل، ترجمہ۔ پیش لفظ XII

۱۲۔ ایم۔ اے مجید یزدانی، گنج بخش بخت عالم۔ صفحہ ۳۳۔ یزدانی صاحب کے اپنا باخدا نہیں کیا۔ تاہم گلزار ابرار کے ترجمہ اذکار ابرار میں دانا صاحب کا مزار غلط طور پر غزنی میں بتایا گیا ہے کشف المحجوب

۱۳۔ مقالات علمی اول ۱۸۸

۱۴۔ کشف المحجوب ۱۶۳

۱۵۔ بلی لغمانی۔ الغزالی۔ صفحہ ۴

۱۶۔ کشف المحجوب ۳۳۳

۱۷۔ بزم صوفیہ صفحہ ۷ حاشیہ ۱

۱۸۔ آثار لاہور۔ جزو دوم ۵۲

۱۹۔ کشف المحجوب صفحہ ۱

۲۰۔ ۹-۱۰

۲۱۔ ۳۰

۲۲۔ ۱۲۰

۲۲۔ نیز دیکھئے مکمل کا اختلافی حاشیہ صفحہ ۱۱۲۔ یہ اس بات کا مزید ثبوت کتاب ربانی بھی گئی۔

۲۳۔ کشف المحجوب ۷

۲۴۔ تحقیقات پیشہ ۱۲۵

۲۵۔ کشف المحجوب صفحہ ۴

۲۶۔ ڈاکٹر مہدی بیانی مقالہ قدیم ترین نوادہ شرفاوی موجود۔ ارمغان علمی صفحہ ۲۲۳ نیز آقائے حبیبی

صفحہ ۵۱

۲۷۔ کشف المحجوب ۲۸۶

۲۸۔ ۳-۳۳۲

۲۹۔ ۲۶۰

کتابیات

اردو

- * اطہر تافہی مبارکپوری ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ندوۃ المصنفین۔ دہلی (۱۹۹۷ء)
- * اکرام، شیخ محمد، "آب کوثر" فیروز سنز لاہور، طبع ششم ۱۹۹۶ء
- * الہجویری، ابوالحسن علی بن عثمان، کشف الاسرار اردو ترجمہ ملک شیر خان اعوان، دارالتالیفات کالاباغ ۱۹۹۳ء
- * اورنیل کالج میگزین لاہور۔ (فروری ۱۹۹۰ء)
- * برنی، ضیاء الدین، "تاریخ فیروز شاہی" ترجمہ ڈاکٹر سید معین الحق، مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۶۹ء
- * پرائمرسی بیل۔ "لاہور شہر" (ناشر و سال اشاعت نامعلوم)
- * پیام شاہ جہاں پوری۔ "آفتاب ججوری" سراج الدین اینڈ سنز لاہور ۱۹۹۳ء
- * چشتی، مولوی نور احمد، "تحقیقات چشتی" لاہور ۱۸۶۷ء
- * داراشکرہ، "سفینۃ الاولیاء" ترجمہ محمد علی لطفی۔ نفس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۹ء
- * سالک، علم الدین "رسالہ گنج بخش"
- * سبحان رائے بتاوی، "خلاصۃ التواریخ" ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۶ء
- * سجری، امیر حسن غلام، "فرائد الفواد" ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۶ء
- * شبلی نعمانی، "الغزالی" شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور (سن نامعلوم)
- * شیخ، مولوی محمد مقالات دینی و علمی لاہور
- * صباح الدین عبدالرحمن، سید "بزم صوفیہ" دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء
- * صباح الدین عبدالرحمن سید "ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک" دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۸ء
- * عبداللہ سید، ارمان علمی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۵۵ء
- * عبدالمجید (دیباچی)، "تصوف اسلام" دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ طبع سوم ۱۹۴۷ء
- * عبدالحی، سید "نہایت الخواطر" ترجمہ ابوسبحی امام نوشہروی، (جلدیں) مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۵ء
- * عبدالحق محدث دہلوی "اخبار لاخیار" ترجمہ لطیف ملک، لاہور ۱۹۶۷ء
- * عبدالقادر، علی حسن "جیند بغداد" ترجمہ محمد کاظم، لاہور ۱۹۶۷ء
- * فاروق، خورشید احمد، اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں (خلاصہ احسن التقاسیم) ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۲ء
- * فرشتہ، محمد قاسم، تاریخ فرشتہ "ترجمہ عبدالحی خواجہ، غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۲ء
- * محب الحسن، کشمیر سلاطین کے عہد میں "ترجمہ علی حماد عباسی، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء
- * ندوی، ریاست علی، "اسلامی عہد کا ہندوستان" ادارۃ المصنفین، پٹنہ ۱۹۵۰ء

* ہاشمی، سید، "ماثر لاہور" ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۵۶ء
 * نیز داتی، ایم۔ اے۔ مجید، "گنج بخش بحیثیت عالم" ادارہ علوم اسلامیہ، لاہور ۱۹۶۸ء

فارسی

* ابوالفضل علامی، "آئین اکبری" نول کشور ۱۸۸۲ء
 * الہجویری، علی بن عثمان، "کشف المحجوب" منقولہ خواجہ بہار الدین زکریا ملتانی۔ مقدمہ و تعارف مولوی محمد شفیع ۱۹۶۸ء
 * جامی، نور الدین، "توحات الانس" کلکتہ ۱۸۵۹ء
 * داراشکرہ، "سفینۃ الاولیاء"۔ نول کشور ۱۸۴۲ء
 * مفتی غلام سرور لاہوری، "سخنرینۃ الاصفیاء" نول کشور کا پتورہ ۱۹۱۴ء

English.

Bosworth, Clifford B., The Chaznavids
 (Edinburgh 1963)
 Habib, Mohammad., Sultan Mahmud of
 Chaznin (Delhi 1951)
 Latif, Syed Mohammad, Lahore (Lahore 1956)
 Nazim, M., The Life and Times of Sultan
 Mahmud of Ghazna (Cambridge 1951)
 Nicholson, Reynold A., Kashf al-Mahjub,
 English translation (London 1959)
 Sachau, Edward C., al-Biruni's India,
 English translation (Lahore 1962)

*

مخدوم علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی
الغزنوی ثم الجویری المعروف به

داتا گنج بخش علیہ السلام

اور

ان کا عہد



خالد محمود



مقبول اکیڈمی، ادبی مارکیٹ، چوک نارگلی، لاہور